ضمیرِ خامہ

مجموعۂ مثنویات و قصائد

رئیس امروہوی

3176

ضمیرِ خامہ

مجموعۂ مثنویات و قصائد

رئیس امروہوی

ضمیرِ خامہ (مجموعہ مثنویات و قصائد)

رئیسؔ امروہوی

+

ناشر

رئیسؔ اکاڈمی

۱۲۹ - اے مانک جی اسٹریٹ - گارڈن ایسٹ - کراچی ۳

فون ۷۱۰۷۳۳ - ۷۱۰۵۵۶

مہتمم ــــــــــــ سیّد مظہر حسین

سالِ طباعت ــــــــــــ سنہ ۱۹۸۸ء

قیمت ــــــــــــ (۷۵) پچھتّر روپے

مطبوعہ ــــــــــــ احباب پرنٹرز کراچی

کتابت ــــــــــــ عبدالحفیظ

سرنامہ

مرزا غالب نے اپنے اشعار کو صریر خامہ قرار دیا تھا (غالب صریر خامہ نوائے سروش ہے) میں نے اِس مجموعے کے لئے ضمیر خامہ کا عنوان منتخب کیا ہے۔ یہ نوائے سروش تو نہیں صدائے خروش ضرور ہے۔ مثنویات و قصائد کے اس مجموعے کو ضمیر خامہ کا عنوان اس لئے دیا گیا ہے کہ میں پچھلے چالیس سال میں باطنی طور پر جو کچھ محسوس کرتا رہا ہوں۔ اُن محسوساتِ باطن اور تاثراتِ ضمیر کو ان مثنویوں اور قصائد کے روپ میں ڈھال دیا گیا ہے۔ قطعات رئیس امروہوی کی طرح ان کا لہجہ بھی کسی قدر طنز آمیز ہے البتہ بوسہ چند بیامیز بہ دشنامے چند کی حکیمانہ نصیحت کے پیشِ نظر ہجو صریح کے بجائے ہجو ملیح کو ترجیح دی گئی ہے۔ چالیس سال سے میرے قطعات (کہ روزانہ کا معمول ہے) مثنویاں اور قصائد برابر چھپ رہے ہیں۔ پاکستان کی سیاسی۔ سماجی اور ثقافتی تاریخ میں جتنے قابل ذکر واقعات (حوادث کہنا چاہیئے) پیش آئے ہیں۔ وہ اکثر ان مثنویوں اور قصیدوں کا موضوع قرار پائے۔ یہ بھی عرض کر دوں کہ میں نے یہ مختصر مثنویاں استادوں کی تجویز کردہ روش اور فنی ترتیب کے مطابق لکھی ہیں یعنی ابتدا ساقی نامے سے کی گئی ہے پھر حمد و نعت، پھر مدح والیٔ ملک۔ اسکے بعد موضوع کی طرف گریز۔ آخر میں خاتمہ اور التماسِ دعا! ۔ میر تقی۔ سودا۔ مصحفی وغیرہ کے زمانے میں یہی ترتیب مضامین مقبول تھی۔ جہاں تک قصائد کا تعلق ہے تو ان کی تصنیف میں بھی اساتذہ کے قدم بہ قدم چلنے کی کوشش کی گئی ہے۔ قافیوں کے انتخاب میں بطورِ خاص کاوش کرنی پڑی۔ تاکہ ابیات میں ڈرامائی کیفیت اور اچھوتا پن پیدا ہو سکے۔ یہ مثنویاں و قصائد درحقیقت شہر آشوب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس زمانے میں جو بلائیں ہم پر نازل ہوئی ہیں۔ جن حوادث سے ہم گذرے ہیں۔ اُنہیں مثنویوں اور قصیدوں کے ذریعے پیش کر دیا گیا ہے۔ اِن قطعات قصائد اور مثنویوں کی شاعرانہ حیثیت کیا ہے؟ مجھے اس سلسلے میں نہ کوئی عذر پیش کرنا ہے نہ کسی داد و تحسین کا طالب ہوں۔ میں تو عالمِ خود رفتگی اور کیفیتِ سرشاری میں لکھتا رہا اور لکھ رہا ہوں۔

مجھے نہیں معلوم کہ زمانہ اِس طومارِ طولانی اور دفترِ لایعنی کے ساتھ کیا سلوک کرے گا۔ راقم الحروف کا ادّعا صرف یہ ہے کہ اُس نے نوائے سروش کے بجائے صدائے ضمیر کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ یہ مجموعہ میرے پورے کلام پر محیط نہیں۔ یہ صرف انتخاب ہے۔ بہت سی نظموں کو میں نے خود مسترد کر دیا۔ بہت سی نظموں نے خود مجھے رد کر دیا۔ ردّ و قبول کا یہ سلسلہ اب تک جاری ہے اور شاید لمحۂ آخر تک جاری رہے۔

ایک بات اور! راقم الحروف کے اب تک کئی مجموعہ ہائے کلام شائع ہو چکے ہیں۔ احباب کے اصرار کے باوجود میں نے کسی مجموعے کے ساتھ اپنی تصویر نہیں چھاپی۔ لیکن اس سلسلے میں احباب کا اصرار اتنا بڑھ گیا کہ اس خود نمائی پر مجبور ہو جانا پڑا۔ میرا یہ فوٹو میرے مخلص دوست اور فدرتی عکس ساز ڈاکٹر احمد ہومیوپیتھ نے اپنی پوری فن کارانہ صلاحیتوں کے ساتھ کھینچا ہے ڈاکٹر صاحب کے ہاتھ میں فوٹو کیمرہ وہی کام کرتا ہے جو پختہ کار مصور کا موقلم۔ ! وہ تصویر نہیں کھینچتے۔ انسانی روح کے لطیف ترین احساسات کی عکاسی کرتے ہیں۔ تو جناب یہ تصویر اور یہ تحریر نذرِ احباب ہے۔

رئیس امروہوی
۱۰ر فروری سنہ ۱۹۸۸ء

مثنویات

سَرمَانامہ

پلا ساقیا! آبِ آتش مزاج!
کہ سردی سے تحریکِ نزلہ ہے آج
اگھن پوس کی سردیاں اور زکام
علاج اِس کا ساقی! برانڈی کا جام
ابھی اور اِس آنچ کو تیز کر
برانڈی میں وہسکی بھی آمیز کر
ذرا کھُل کے مِل اِس طرح کھُل نہ کھیل[1]
تجھے میرے سر کی قسم کاک ٹیل
یہ سردی کا موسم یہ طوفانِ باد
کہ خود جم گیا نقطۂ انجماد
یہ قطبِ شمالی کی سیدھی ہوا
کراچی کی یہ زمہریری فضا
لگی سخت سردی میں یہ اور تخ
کہ ہر شخص ہے سرد مہری سے تخ
گِلہ کیا دلوں میں جو نرمی نہیں
لہو میں بھی ملّت کے گرمی نہیں

---

[1] کھُل کھیلنا۔ بے تکلفانہ ہنگامہ آرائی۔

یہ سردی کہ دورِ جہاں تھم گیا
کہ موسم جہاں کا نہاں تھم گیا
وہ صورت نہیں وہ بحالی نہیں
حسینوں کے چہرے پہ لالی نہیں
دلِ مُردہ اِک منجمد لاش ہے
خدا کی قسم برف کی قاش ہے
وہ اب سوزِ غم وہ حرارت کہاں؟
نکلتا نہیں آہ تک سے دھواں
جو تھے گرم جوشی کے جنگل میں شیر
کیا ہے انہیں آکے سردی نے زیر

دربیانِ غلبہ سرما

بیاں کیا کروں میں بُرودت کا حال
کہ الفاظ لرزاں ہیں وقتِ مقال
یہ سرما کہ نبضِ جہاں تھم گئی
جو بات آئی لب پر وہیں جم گئی
نکلتی ہے ہونٹوں سے اِس طرح بھاپ
کہ باتیں بنانے سے عاجز ہیں آپ

نہیں ایسے موسم میں کچھ بھی عزیز
کہ خالی ہے گرمی سے ہر ایک چیز
پسندِ فسردہ دِلاں ہیں مگر!
فقط شعلہ و شمع و برق و شرر
کیّا آسماں نے عجب بندوبست
بنے ہیں مسلمان آتش پرست
جو ہنتھ چھُٹ تھے شعلہ مزاجوں کے ساتھ
وہ اب تاپتے ہیں انگیٹھی پہ ہاتھ
جو دیپک[1] کی دُھن میں نہ سنتے تھے راگ
وہ اب چیختے ہیں کہ للّٰلہ آگ
کرو لاکھ خلوت میں بے شرمیاں
دکھاتے نہیں شمع رُو گرمیاں
برستے تھے جن تیوروں سے شرر
مجسّم برودت ہیں تخ سر بہ سر
چمکتی تھی جن کی نگاہوں میں برق
عرق میں خجالت کے ہیں اب وہ غرق
جن آنکھوں سے ہر دم نکلتی تھی آنچ
وہ برفاب ہیں۔ دیکھئے کر کے جانچ

[1] مشہور ہے کہ دیپک راگ سے آگ بھڑک اٹھتی ہے۔

نہ سودا ہے سر میں نہ جی میں اُمنگ
غرض یہ کہ سردی سے دنیا ہے دنگ
ہوئے ہیں جو سردی سے عاجز سبھی
جہنم سے ڈرتا نہیں اب کوئی!
دعا مانگتے ہیں یہ خاکی نہاد
کہ ہوتے وہ مخلوق آتش نژاد

در ذکر احوال مخلوق

کسے گرمیٔ بزم پر ہو گھمنڈ
یہ جاڑا یہ پالا یہ کُہرا یہ ٹھنڈ
سکڑ جائیں کیوں کر نہ سینوں کے ظرف
یہ سردی یہ خُنکی یہ بادل یہ برف
ٹٹولا تھا ٹھنڈی ہوا نے ذری
چڑھی شمع کی لَو کو بھی تھرتھری
ہزار اس نے تاروں کی مالا جپی!
چڑھی صبح دم - مہر کو کپکپی

برآمد ہوا ٹھٹھراتے ہوئے
انگیٹھی جگر میں چھپائے ہوئے
نہیں برف کی تہ سرِ کوہ قاف
وہ اوڑھے ہوئے ہے سموری لحاف
نہیں برف و یخ سے کسی کو اماں
لیاقت علی خاں کہ گُل شیر خاں
جو کہتے تھے پالا لیا ہم نے مار
حقیقت میں پالا گیا اُن کو مار
بھلا کون ایسے میں ہو دست بوس
پڑی ہے وزیرانِ ملّت پہ اوس
جو گرما کے کرتے تھے سر[1] گرمیاں
وہ بھولے ہیں سردی میں سرگرمیاں
نہ کچھ رہ نمایانِ ملّت میں جوش
نہ پبلک میں باقی ہے جوش و خروش
گیا برف باری سے سب کچھ جو بھیگ
تو سمٹی پڑی ہے سرِ بزم لیگ[2]

---

[1] سر کرنا۔ فتح کرنا۔ [2] پاکستان مسلم لیگ جس کے صدر لیاقت علی خاں تھے۔

حرارت سے خالی عمل سے تہی
سہروردی و باری و مشرقی

خطاب بہ ساقی

تو پھر ایسے لمحات میں ساقیا
مے ناب ہے تحفۂ باقیہ
پگھلتی ہوئی جوش کھاتی ہوئی
حرارت کا لاوا بہاتی ہوئی
وہ ہنگامہ پرور وہ ہنگامہ خیز
جوالا مکھی کی طرح تند و تیز
نہ افسردہ تاک پر ٹال دے
مجھے پے بہ پے برق سیال دے
عطا کر مجھے ساقیا برمحل
وہ مے جس میں ہو شعلۂ سرخ حل
مبارک فرنگی کو ہر کاکٹیل
مرے جام زر میں جہنم انڈیل
مئے برق افشاں مئے شعلہ بار
فقط جس کو دیکھے سے آئے خمار

۔ سہروردی ۔ میاں عبدالباری ۔ علامہ مشرقی ۔ ان کا تعلق [illegible] تھا۔

ہر اک بے نوا کی مدارات کر
بکثرت برانڈی کی خیرات کر
کرے برف باری کا جو بھی گلہ
مئے سرخ کی اس کو بوتل پلا
بنا دے حکومت کو بھی صاف صاف
کہ سرما زدوں میں نہ بانٹے لحاف
وہی ہے وہی سردیوں کا علاج
جو کرتے ہیں حکامِ رنگیں مزاج

خاتمۂ کلام

بس اب اے زبانِ صداقت بیاں!
دعا کر بدر گاہِ ربّ جہاں
کہ یا رب بحقِ رسولِؐ انام!
بحقِ امامانِ عالی مقام
مری قوم کو گرمیٔ کار دے
حرارت انہیں بہرِ پیکار دے
برودت نہ سرّی[1] نہ جہری رہے
نہ سردی نہ یہ سرد مہری رہے

---

[1] سرّی - پوشیدہ - جہری - علانیہ

جہنّم کے پگھلے ہوئے ناگ دے
مجھے آگ دے آگ دے آگ دے
مناسب ہے ساقی! شرروں کا ذکر
نہ سردی نہ سردی کے ماروں کا ذکر
سنا ہے یہ میں نے بھی اے شعلہ رنگ!
ہزاروں مہاجر ہیں جاڑے سے تنگ
سُکڑ کر شکارِ قضا مر گئے!
اکڑ کر کئی بے نوا مر گئے
بچے ہیں جو مرنے سے وہ اہلِ درد
ہوا کھا کے بھرتے ہیں اِک آہِ سرد
دعا مانگتے ہیں شب و روز یوں
کہ ٹھنڈی ہوا سے ہے حالت زبوں
کریما بہ بخشائے بر حالِ ما
کہ ہستم اسیرِ کمند ہوا
مناسب یہ ہے ساقیٔ نیک دل
برانڈی کے دریا بہا متصل
ہیں جتنے کراچی کے سرما زدہ
اِسی آنچ سے اُن کی سردی گھٹا

عید نامہ

کہاں ہے تو اے ساقیٔ روزہ دار
کہ ہے روزہ خوروں کو سخت انتظار
ملی ہے ابھی ریڈیو سے خبر
کہ ہے عید کا چاند پیشِ نظر
مبارک ہو رعنائیٔ ماہ عید
کہ فاقہ کشوں کی بر آئی امید
ترے علم میں ساقیٔ خوش خصال
نہیں کیا گذشتہ مہینے کا حال
کہ آیا جو دن تیس شعبان کا
تو غائب رہا چاند رمضان کا
حکومت نے جس دن سنی یہ خبر
بلائے گئے مولوی چھانٹ کر
انہیں اِک ڈکوٹے[1] میں کر کے سوار
روانہ کیا سوئے چرخ ایک بار

[1] ڈکوٹا۔ چھوٹا ہوائی جہاز۔

کہہ سے مدّعیانِ فکر و نظر!
ذرا چاند کی لے کے آؤ خبر
ہوئے مولوی عرش کو جب رواں
تو ہاتف نے آواز دی ناگہاں
تو کارِ زمیں را نکو ساختی
کہ با آسماں نیز پرداختی[1]

التجا بہ ساقی

مجھے ساقیا کر وہ بوتل الاٹ
کہ زہّاد کو ڈانٹ دے جس کی ڈاٹ
وہ بوتل کہ جس میں وزارت اسیر
جسے پی کے بن جاؤں میں بھی وزیر
وہ بوتل کہ نشہ ہو جس کا قوی
جسے پی کے سوجھے فقط لیڈری
جسے پی کے دل کی کلی جائے کھل
الاٹ آج جیسے ہوئے چار مل
وہ مے جس میں خدمت کی تلخی نہ ہو
عوامی قیادت کی تلخی نہ ہو

---

[1] مشہور شعر (تو نے زمین پر کیا کارنامہ انجام دیا ہے کہ آسمانی معاملات میں الجھ گیا)

وہ مے جس کی کرتے ہیں کھل کر کشید
وزارت پناہوں کے سچّے مرید
وہ مے جس کے ساقی ہیں اربابِ جاہ
وہ مے جس کے پیرِ مغاں کج کُلاہ
وہ مے جس کا ساغر حکومت کا جام
وہ جامِ معلیٰ کہ ہے جم مقام
پلا ساقیا! بس وہی جامِ جم
لیاقت علی خاں کی تجھ کو قسم
قسم تجھ کو حُکّامِ ذیشان کی
وزارت کے عشّاقِ نادان کی
قسم ان کی آتی ہے جن کو ریا
بچھاتے ہیں قالین پر بوریا
قسم ان کی جو ہیں بڑے تیز ہوش
کہ گندم نما اور پھر جو فروش
بدلتے ہیں ظالم قیامت کی جُون
جو پیتے ہیں چھک چھک کے مفلس کا خون
جو ہیں جلوہ گر فرشِ کم خواب پر
غریبوں کے غم میں ہیں بسمل مگر

تجھے اُن بزرگوں کی ساقی قسم
کہ جن کا عقیدہ ہے دامِ و درم
پلا اُن کی خاطر میں تیرے نثار
جو کھاتے ہیں روزے کوئی کرسِگار
نہ روزہ رکھا ایک بھی کام کا
کریڈٹ ملا پھر بھی اسلام کا

تہدید و تنبیہ

یہ کیوں تو نے اے احمقِ ماہِ صوم
کیا پھر مرے سامنے ذکرِ قوم
دلائل ہیں واللہ تیرے عجیب
مجھے کیا اگر قوم ہے بدنصیب
اگر آج بھی بے شمار آدمی
وطن میں ہیں محرومِ عیش و خوشی!
مجھے کیا اگر شہر کے مرد و زن
کراچی کی سڑکوں پہ ہیں خیمہ زن
مجھے کیا اگر عید کے روز بھی
ہزاروں ہیں آمادۂ خودکشی!

مجھے کیا اگر ایک لاکھ اہلِ قوم
نہ دن بلکہ راتوں رہے وقفِ صوم
یقیناً ہزاروں ہیں اتنے غریب
جنہیں لقمۂ خشک ۔ نعمت عجیب
یقیناً بہت سے ہیں ایسے بھی لوگ
منائیں گے جو عید کے دن کا سوگ
ہزاروں ہیں ایسے بھی غیرت پسند
جو بوسیدہ کپڑوں میں ہیں گھر میں بند
چُھپے عید کے روز یہ سوچ کے
کہ گوشہ نشینی کا پردہ رہے
کوئی شک نہیں اَن گِنت عورتیں
کوئی جن کا وارث نہیں شہر میں
گیا ہے سبھی کچھ جو دُکھیوں[1] سے چِھن
گذاریں گی رو رو کے گھر میں یہ دن
یقیناً ہزاروں غریب و یتیم
نہ سمجھیں گے مفہومِ عید اے ندیم
یہ سب کچھ بجا ہے یہ سب کچھ دُرست
مگر ساقیا ! ہو کے چالاک و چُست

---

[1] دُکھی کی جمع دُکھیوں

مجھے اِذن دے۔ لِے سبو تھام جام
عدو سے یہ کہدے بڑھا تمام جھام
میں کب تک غمِ قوم و ملّت سہوں؟
میں کب تک لیاقت علی خاں رہوں؟
نہ رکھ مجھ سے امّیدِ ایثار تو
نہ کہہ یوں حضور اور سرکار تو
کوئی قائدِ کامراں میں نہیں
وطن میں خلیق[1] الزماں میں نہیں
کراچی کی حالت سے بندے کو کیا
نہ ہاشم[2] رضا ہوں نہ کاظم رضا
نہ تہمت نہ طعنے نہ الزام دے
مجھے عید کا روز ہے جام دے
مجھے کیا جو مخلوق بے آس ہے
خدائی کا ٹھیکہ مرے پاس ہے؟
منسٹر کہ ڈپٹی منسٹر نہیں
کہ مُلّا نہیں اور مسٹر نہیں؟

---

[1] چودھری خلیق الزماں مرحوم۔ تحریک خلافت اور مسلم لیگ کے مشہور لیڈر رہے ہیں۔ ان سے لیاقت علی خاں کی چشمک تھی اور قائداعظم بھی کچھ کشیدہ رہتے تھے۔ [2] سید ہاشم رضا کراچی کے پہلے ایڈمنسٹریٹر تھے اور ان کے بھائی سید کاظم رضا انسپکٹر جنرل پولیس۔

خاتمہ کلام

دُعا کر یہ ساقی کہ اگلے برس
حکومت نوازے مجھے یوں کہ بس
مری شہرتیں ہوں بعید و قریب
الیکشن میں ہو کامیابی نصیب
مجھے دیکھے اِس حال میں آ کے عید
کہ گھیرے ہوئے ہوں ہزاروں مرید
دعا ہے کہ صدر اور سکتّر[1] بنوں
منسٹر، کہ ڈپٹی منسٹر بنوں!

[1] ہمارے بزرگ سکریٹری کا تلفظ سکتّر کرتے تھے۔

پاکستان نامہ

حمد و نعت

بنامِ خدا خالقِ آب و خاک
کہ بخشی ہے جس نے ہمیں ارضِ پاک
خداوندِ بحر و بر و خشک و تر
گنہ بخش روزی رساں داد گر
مہ و مہر و کون و مکاں آفریں
وہ جاں آفریں وہ جہاں آفریں
وہ جس نے کہ اک آن میں کر دیا
غریبوں کو آزاد و فرماں روا
خرابوں کو آبادیاں بخش دیں
غلاموں کو آزادیاں بخش دیں
وہ ملّت کہ مایوس و مظلوم تھی
جو انگریز و ہندو کی محکوم تھی
جو اپنے وطن میں تھی زار و نزار
بدیسی کے ہاتھوں غریب الدیار
فسردہ رواں و فسردہ جگر
نہ تھا جس کے سینے میں کوئی شرر

خدا نے اُسے سلطنت بخش دی
نیا ملک اور مملکت بخش دی
پس از حمدِ پاکِ خدا اے قلم
ثنائے حبیبِؐ خدا کر رقم
وہ مخلوقِ اول وہ ختم الرسلؐ
ریاضِ مشیّت کا شاداب گُل
وہ آقا ہمارا ہم اُس کے غلام
محمدؐ پہ لاکھوں درود و سلام
بہ آلِ رسولؐ و بہ اصحابِ پاکؓ
سلام و تحیّات و آدابِ پاک

در مدح قائدِ اعظم

اگرچہ بہ تائیدِ ربِّ کریم
ملے قوم کو رہ برانِ عظیم
وہ سیّد[1] کہ سر اور سالار تھا
علی گڈھ میں کالج کا سردار تھا
وہ حالی[2] کہ نغموں سے ہے جس کے گرم
جوانانِ اسلام کا قلبِ نرم

[1] سرسیّد۔ [2] مولانا الطاف حسین حالی۔

وہ شبلیؒ وہ جوہر وہ شوکت علی
قیادت ہے جن کی جہاں پر جلی
یہ منزل نما۔ کیا مدبّر نہ تھے
مگر نقشِ نو کے مصوّر نہ تھے
مفکّر کی مسند تھی خالی اگر
تو اقبال آکر ہوئے جلوہ گر
جو دیکھا تھا صدیوں سے ملّت نے خواب
وہ ثابت ہوا مژدۂ انقلاب
محمد علی المخاطب جناح
اٹھے لے کے پیغامِ خیر و فلاح
سبق جہدِ پیہم کا جن کی حیات
مجسّم عزیمت سراپا ثبات

خواجہ ناظم الدینؒ

خوشا خواجۂ خواجگانِ جلیل
ہر اک رنگ میں عادل و بے عدیل
خدا نے دیا ہے عجب کرّ و فر
شہٖ بے کُلہ خسرو بے کمر!

ؒ علامہ شبلی۔ مولانا محمد علی جوہر۔ شوکت علی۔ ؒ خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل پاکستان۔

شہنشاہِ بے افسر و بارگاہ
فقط عرش توقیر و انجم سپاہ
نہیں ان کے رتبے سے آگاہ تو
کہ وہ ہیں فقط دامِ اقبالہُ
زہے عظمت خواجۂ نیک بخت
کہ ہیں تاج بخش اور بے تاج و تخت
خدا اُن کے عہدے کو بخشے ثبات
بحقِّ عبادات و صوم و صلوٰۃ

وزیر الممالک

لیاقت ہے دنیا پہ جن کی جلی
وزیر الممالک لیاقت علی
بظاہر پرائم منسٹر ہے وہ
مگر اصل میں شاہِ کشور ہے وہ
شہی دستگاہ و وزارت نباہ
وزیروں کا پیر اور شاہوں کا شاہ
خدا نے دیا ہے اُسے یہ مقام
ٹرومین[1] کرتے ہیں جُھک کر سلام

[1] صدر ریاست ہائے متحدہ امریکہ۔ جنکی دعوت پر خان لیاقت علی خاں مرحوم امریکہ گئے تھے۔

اراکینِ وزارت

کروں کیا وزیروں کی اپنے صفت
کہ ہیں مایۂ نازشِ مملکت

بظاہر یہ سب ہیں وزارت پناہ
مگر طرز و اطوار میں بادشاہ

کوئی ان کی مدح و ثنا کیا کرے
یہ سب لاڈلے ہیں مری قوم کے

وہ فارن منسٹر ظفر[1] جن کا نام
وہ یو این کے رستم سیاست کے سام

وہ پولیٹکل معرکوں کے وکیل
مقرّر ۔ مدبّر خطیبِ جلیل

متانت بھی دی چلبلاہٹ[2] بھی دی
خدا نے انہیں چودہراہٹ بھی دی

بجٹ کی ترائی کے وہ شیر نر
غلامِ محمد[3] یلِ نام ور !

خزانے کی جن کے سبب آبرو
وہ ٹیکسوں کے دنگل میں سب کے گرو

---

[1] چودہری سر محمد ظفراللہ وزیر خارجہ۔ [2] چلبلاہٹ شوخی۔ [3] غلام محمد وزیر مالیات۔ یلِ نامور یعنی مشہور پہلوان۔

مداخل[1] ہیں گو پھاندلیں کھائیاں
مصارف کی حد تک بڑے کائیاں
کوئی کیا چکائے حکومت کے ٹیکس
لگائے انہوں نے قیامت کے ٹیکس

لہو چوس لینا جو معمول ہے
یہاں چائے پانی پہ محصول ہے
لگائے ہیں وہ ہم پہ اور تم پہ ٹیکس
تبسّم پہ ٹیکس اور تکلّم پہ ٹیکس
اگر بس چلے گل سے بُو چھین لیں
دلوں سے ہر اک آرزو چھین لیں

وہ ذی مرتبت خواجۂ شیخ و شاب
کہ ہیں آفتاب اور ظاہر شہاب[2]
بہت سوں کو حضرت سے ہے یہ گلہ
کہ حضرت ہمیں آپ سے کیا ملا؟
کسی کو ہوئے کارخانے الاٹ
نشیمن الاٹ آشیانے الاٹ
کسی کو سنیما کے حصّے ملے
گورنمنٹ سے! اور کس سے ملے؟

---

[1] یعنی گو آمدنی کے حصول کے تمام مرحلے طے کر لیتے۔ [2] خواجہ شہاب الدین وزیر اطلاعات و نشریات۔

بہت سے ہیں ملّت میں گردوں نشیں
ہمیں جھونپڑا تک میسّر نہیں
یہ مانا کہ لاکھوں بسائے گئے
مگر وہ جو ناکام آئے گئے؟
غرض اپنا کابینۂ محترم
مثال آپ اپنی خدا کی قسم
طوالت سے کیا فائدہ اے ندیم
دعا ہے بدرگاہِ ربِّ کریم!
ہمارے وزیرانِ ذی جاہ کو
ریاست پناہانِ دل خواہ کو
عطا ہو شکوہِ سلاطین دہر
کہ ہیں شہریارانِ دیہات و شہر

ساقی نامہ

اٹھ اے ساقیٔ مست و بادہ پرست
کہ سج بن کے آئی ہے چودہ اگست
مےٴ تلخ سے اب ہے حالت سقیم
پلا ساقیا مے ہیں آئس کریم

خراب آج ہے سب کے موںہہ کا مزہ
افیم اپنے تشنہ لبوں کو چٹا
نہ کیوں دخترِ رز کو دیدیں طلاق
بہت چِلنیا بیگم کی فرقت ہے شاق
افیمی پہ جنّت کے دَر کھول دے
یہی کیمیا جام میں گھول دے
اگر چینیا بیگم ہے مائل بہ جنگ
تو اے ساقیٔ سبزہ رُخ گھول بھنگ
دکھائے نہ کیوں طفلِ دل کو دھاند
یہ چودہ کی شب چودہویں کا یہ چاند
یہ عیدِ گراں مایۂ حرّیت
یہ ملّت کو سرمایۂ حرّیت
یہ آزاد بندوں کا یوم سعید
یہ چوتھا برس اور چوتھی یہ عید
مئے آتشیں مجھ کو ساقی پلا
یہ دو آتشہ کیوں چہار آتشہ
نہ کیوں اُس کے جلووں سے ہو قوم ماند
لگے پانچویں سال کو چار چاند

بیادِ ماضی

مرے ذہن میں ہے وہ چودہ اگست[1]
کہ تھے حوصلے اہلِ ملّت کے پست
کراچی میں تھا جشنِ آزادگاں
مگر خاک۔ دہلی کی تھی خونچکاں!
پھنسے تھے مسلمان گرداب میں
قیامت تھی یوپی میں پنجاب میں
کوئی محرمِ چشمِ نم تک نہ تھا
کوئی اپنا پرسانِ غم تک نہ تھا
ذلیل و شکستہ دل و زار و پست
وہ ماہِ اگست اُف وہ ماہِ اگست
جو دیکھا اِدھر ہم کو جینے سے تنگ
بجایا عدو نے اُدھر طبلِ جنگ
بڑھے پھر سبھائی و سنگھی جواں
جِلو میں اجل حادثے ہم عناں
کڑکتے ہوئے غل مچاتے ہوئے
گرجتے ہوئے گنگناتے ہوئے

---

[1] اگست ۱۹۴۷ء کے آخری دو ہفتے میں دلی، مغربی یوپی، راجپوتانہ اور پنجاب میں اقلیتوں کا قتلِ عام شروع ہو گیا تھا۔

اُمڈتے اُچھلتے اُبھرتے ہوئے
بگڑتے سمٹتے اُپھرتے ہوئے
جھکتے۔ بدکتے۔ پھدکتے ہوئے
مچلتے تڑپتے لپکتے ہوئے
تباہی کا اقدام ہر اِک قدم
رکھے دوش پر زعفرانی علم[1]
جو تشنہ ہر اِک خون کی مے کا تھا
تو نعرہ مہابیر کی جے کا تھا
بھڑے یوں نہتے مسلمان سے
کہ بکری پہ جیسے پلیں بھیڑیئے
مگر حق نے بخشا ہمیں وہ ثبات
کہ ٹکرا کے کھائی حوادث نے مات

نغمۂ فتح

جو دنیا پہ چھائے وہ بادل ہیں ہم
نئے قافلوں کے ہراول ہیں ہم
رہِ عزم میں ٹوک سکتا نہیں
ہمیں اب کوئی روک سکتا نہیں

---

[1] متعصب ہندو جماعت جن سنگھ کے پرچم کا رنگ زعفرانی تھا۔

خوشا کشورِ پاک اے جانِ پاک
اُگلتی ہے لعل و گہر جس کی خاک
عجب اِس چمن کی ہے وضع و قماش
ہوا عنبر افشاں فضا عطر پاش
جواں تر ہر اک قوم سے لا کلام
ہمارے بہادر ہمارے عوام
ہماری امانت نظامِ جدید
نہ لندن نہ ہم ماسکو کے مرید
چچا[1] سام سے کوئی نسبت نہیں
کوئی جان بُل سے عقیدت نہیں
ہمارا عمل ہے ہماری نجات
ہمارا عقیدہ ہماری حیات
نہ کیوں سازِ نصرت بجائیں بھلا
نہ کیوں نغمۂ فتح گائیں بھلا
مبارک یہ جشنِ بہار آفریں
بہار آفریں اعتبار آفریں
مگر بسکہ اِس پر بھی ہے دل ملول
کوئی خاک دے شعر خوانی کو طول

---

[1] چچا سام اور جان بُل برطانیہ کا استعارہ ہے۔

دعا ہے یہی اپنی آٹھوں پہر
میسّر ہوں خانہ بدوشوں کو گھر
بحقِ لیاقت علی اے خدا!
مجھے غیب سے کوئی مِل ہو عطا
الٰہی! کسی پیر جی کی قسم
خلیق الزماں چودھری کی قسم
مسلماں ہوں اک حورِ جنّت ملے
مجھے عقدِ ثانی کی مہلت ملے
میں اہلِ وطن کا ہراول بنوں!
گورنر بنوں اور جنرل بنوں
ہوا نظمِ تازہ کا جب بندوبست
وہ تھا سَن پچاس اور چودہ اگست
لکھا جب نوشتہ یہ تقدیر کا
وہ شب تھی شبِ قدر دن پیر کا

برشگال نامہ

پلا ساقیا ۔ بادۂ خوشگوار
کہ برسات لائی پیامِ بہار
نہ مستی کے درجاتِ عالی گھٹا
گلابی پلا آئی کالی گھٹا
پلا قبلہ رُو ہو کے لے رشکِ ماہ
اٹھا پھر وہ قبلے سے ابرِ سیاہ
وہ مے جس میں مستی ہو برسات کی
سہانی نشیلی حسین رات کی
وہ مے جس میں تاثیرِ موجِ نسیم
خجل جس سے برگِ حشیش و افیم
وہ مے زاہدوں نے جو چکھی نہ ہو
پڑی جس میں توبہ کی مکھی نہ ہو
وہ مے جس کو پی لیں اگر شیخ جی
تو خوفِ سقر سے ہو آزاد جی
جو مے قوم کی دسترس میں نہ ہو
جو حسرت نصیبوں کے بس میں نہ ہو

آمدِ برشگال

زہے آمدِ موسمِ برشگال
کہ باسی کڑھی کو بھی آیا اُبال
کراچی کہ تھا خشک اک سال سے
کسی خشک ملّا کے اقبال سے
دعائیں ہوئیں مے کشوں کی قبول
ہوا ہم پہ فضلِ خدا کا نزول
کرو جلد پیرِ مغاں کو یہ فون
کہ بحرِ عرب سے اٹھی مان سون
گرجتی ہوئی گنگناتی ہوئی!
چلی ناچتی اور گاتی ہوئی!
ہواؤں کے دھارے بدلتی ہوئی
تڑپتی ہوئی اور مچلتی ہوئی!
غریبوں کو برباد کرتی ہوئی!
کلفٹن کو آباد کرتی ہوئی!
قیامت کی دھومیں مچاتی ہوئی!
قیادت کی شانیں دکھاتی ہوئی

لیاقت علی خاں کی اِس میں زِرت
خلیق الزماں کی چَلت اور پھرت
کبھی لیگ کا اِس میں جوش و خروش
کبھی سُست و کاہل کبھی فتنہ کوش
کبھی اِس کی آواز جیسے کھرج
کبھی لہجۂ مولوی کی گرج
کبھی اُس کی رفتار سے آشکار
وزیرانِ دولت کا حِلم و وقار
کبھی اُس کے انداز میں جلوہ گر
اَمیرانِ ملّت کی فکر و نظر
مبارک ہو یہ کالی کالی گھٹا
نشیلی ۔ سیہ ۔ لا اُبالی گھٹا
برسنے پہ آئی تو جل تھل بھرے
مگر قدرتی نکتہ چیں جل مرے
کسی نے اِسے ابرِ رحمت کہا
کسی نے اِسے جبرِ زحمت کہا
شکایت نہیں ہے کسی اور سے
مگر وہ جو آئے تھے لاہور سے[1]

[1] لاہور کے ایک بزرگ نے ان بارشوں کو حکام کی بداعمالی کے سبب قہرِ الٰہی قرار دیا تھا۔

جو دیکھا کہ بارش کے ہاتھوں تباہ
ہزاروں مہاجر ہیں بے اشتباہ
تو لاہور کے یہ حقیقت شناس
پکارے بھری بزم میں بے ہراس
کہ ناکارہ ہیں سب وزارت پناہ
مہاجر ہوئے جن کے ہاتھوں تباہ
کبھی عقل سے کام لیتے نہیں
مکاں تک غریبوں کو دیتے نہیں
نہ کیونکر حکومت پہ پانی پڑے
جو بہتے ہوں طوفان میں جھونپڑے
کہاں تک مچائے بھلا قوم شور
گھٹا کا یہ عالم ہوا کا یہ زور
برستا رہا ابرِ رحمت اِدھر
حکومت پہ برسا کیئے یہ اُدھر
مگر کوئی ان احمقوں سے کہے
کہاں تک کوئی محوِ خدمت رہے
ہمارے وزیرانِ اعلا مقام
مہاجر کے ہرگز نہیں ہیں غلام

کوئی بات ہو اِن پہ لزام ہے
کہ جیسے اُنہیں کا ہر اِک کام ہے
ذرا سوچیئے ۔ سوچیئے اک ذرا
یہ اچھا طریقہ ہے تنقید کا
کہ جو حادثہ رونما ہو کہیں
وزارت پہ ہوں بے دھڑک نکتہ چیں
مہاجر ہوں گر بارشوں سے خراب
وزیرِ مہاجر سے مانگو جواب
اگر ہو کہیں کوئی جھگّی شہید
لیاقت علی اُس کی بھیجیں رسید
اگر ایک بڑھیا کو آئے بخار
تو ٹھہرائیں حکّام کو ذمہ دار
اگر کوئی تلّت ہو نامہ سیاہ
تو حکّام کی کیا خطا کیا گناہ
وزارت سے کیسا گلہ اے عزیز
وزارت نہیں احمقوں کی کنیز
کسی لَن ترانی کی حاجت نہیں
کسی نوحہ خوانی کی حاجت نہیں

دعوتِ نشاط

طبیعت ہے گرمی سے بے حد نڈھال
پلا ساقیا ! بادۂ برشگال !
گنہ گار افراد کی جانچ تھی
فلیٹوں میں دوزخ کی سی آنچ تھی
ہوا کھا کے ہوتی تھی حالت سقیم
نہ قلفی نہ شربت نہ آئس کریم
بہ فضلِ خداوندِ ابر و ہوا !
ہوا لے کے آئی پیامِ شفا
مہاجر غریبوں کی پروا نہ کر
تو اِن بدنصیبوں کی پروا نہ کر
بقول وزیرانِ عالی تبار
غریبوں کی تعداد ہے بے شمار
یہاں شہر میں چند لاکھ آدمی
پڑے ہیں نہیں جن کا پرساں کوئی
اگر آج بارش میں بہ جائیں وہ
اگر صدمۂ مرگ سہہ جائیں وہ

نہ آئے گی ملت میں کوئی کمی
کہ دنیا سلامت تو لاکھ آدمی

فلسفۂ عیدِ قرباں

قلم پہلے لکھ حمدِ جاں آفریں!
وہ جاں آفریں وہ جہاں آفریں
خدائے بزرگ و قدیر و قوی
وہ خلّاق چوپایہ و آدمی
زہے آفرینندہ خشک و تر
زجِنّ و ملک تا بہ اسپ و شتر
وہ رزّاق مطلق وہ روزی رساں
جہاں میہماں اور وہ میزباں
بنایا بشر کو اگر گوشت خور!
تو پیدا کیے گھاس چرنے کو ڈھور
نباتات کو اُن کے تابع کیا
بنایا انہیں آدمی کی غذا
ہوئے نسبت ذبح سے ارجمند
بُز و آہو و دنبہ و گوسفند

خوشا حکمتِ خالقِ جن و انس
بنائی کچھ ایسے ہر اک نوع و جنس
کہ محتاج ہے ایک کا دوسرا
یہ اُس کی غذا ہے وہ اِس کی غذا
نباتات حیوان کی ہے غذا
ہر اک بھینس ہے آخرش شوربا
وہ آہو کہ صحرا کا جس سے شباب
مری قاب میں ایک شامی کباب
زہے دنبۂ چست و چالاک و نرم
کہ آخر ہیں بریانیٔ گرم گرم
وہ چوپایہ قوموں کے مرد بزرگ
بڑھے سیدھے سادھے مگر کہنہ گرگ
جو بدنام ہیں شہر میں چاروں کھونٹ
وہی شیخ جی الملقب بہ اونٹ
سماتے نہیں گو کسی ہیگ میں
مگر آ پھنسے ایک دن دیگ میں
غرض یہ کہ نظمِ جہاں ہے یونہی
مقدر کا سکّہ رواں ہے یونہی

ہر اِک طرح قادر ہے نوعِ بشر
جمادو نباتات و حیوان پر
یہ مانا کہ جنگل کے راجا ہیں یہ
مگر ابنِ آدم کا کھاجا ہیں یہ
ذبیحے پہ جو لوگ ہیں نکتہ چیں
وہ آئینِ قدرت سے واقف نہیں
نہیں ذبحِ حیواں ستم رانیاں
کہ دستورِ قدرت ہیں قربانیاں
ذبیحہ نہیں بے زباں کے لئے
بشر بھی ہے تسلیمِ جاں کے لئے
اگر آدمی حق پہ قربان ہو
تو پھر سچّے معنی میں انسان ہو
زہے عزمِ قربانیٔ کامراں
کہ معراجِ آدم ہے تسلیمِ جاں
یہ تسلیم ہی عین اسلام ہے
یہی عیدِ قرباں کا پیغام ہے
پلا ساقیا! یخنیٔ گوسفند
کہ ہیں عیدِ قرباں پہ مے خانے بند

جو وہسکی گراں ہے تو کچھ غم نہ کھا
فقط شوربے پر کریں اکتفا
میسّر نہیں ہے جو نقل و گزک
کلیجی کو کھا لیں چھڑک کر نمک
گوتّیے کے کھٹّے کریں آج دانت
کہ بکرے کی ہر آنت بن جائے تانت
یہی عید قربان کا ہے ماحصل
کہ ہم پورے دنبے کو جائیں نگل
نمازوں کی حاجت نہ سجدوں کا ذکر
کہ بندے کو ہے پیٹ پوجا کی فکر

نباتات وجمادات

جمادات ہیں سب سے رُتبے میں پست
نباتات حیوان کے زیرِ دست
جمادات پر ہے زروئے شمار
نباتات کی زندگی کا مدار

یہ ثابت ہے رنگِ نباتات سے
یہ پلتے ہیں خونِ جمادات سے
نمی چوس کر تودۂ خاک کی
نمو ہے گل و خار و خاشاک کی
نہ کیوں لالۂ کوہ ہو بے نظیر
یہ پیتا ہے پتّھر کی چھاتی سے شیر
بہاریں ہیں جن سے نباتات کی
وہ قربانیاں ہیں جمادات کی

چرند پرند

نباتات سے مرتبے میں بُلند
خدا نے بنائے چرند و پرند
جُگالی کے عادی نہیں ایک پل
چرندم خورندم یہ اِن کا عمل
بظاہر یہ ہیں گوشت کے لوتھڑے
بباطن مرکّب نباتات سے
نہ کھا اونٹ کے قدوقامت سے ہول
نکالا ہے کیکر نے سب ڈیل ڈول

شکم بھینس کا گو شکم نام ہے
فقط گھاس چارے کا گودام ہے
ذرا گائے کی پیٹھ پر ہاتھ پھیر
یہ کیا ہے فقط گھاس کا ایک ڈھیر
نہیں کچھ بھی دُنبے کا وزن وشمار
کہ دانے کی بوری ہے گو جاندار
گوالا مُصر ہے کہ بکری ہے یہ
مگر ساگ پتّے کی گٹھری ہے یہ
غرض زندگی کا یہی ہے نظام
اِسی طرح قدرت کے چلتے ہیں کام
بنائے ہیں درجہ بدرجہ بُلند
جماد و نبات و چرند و پرند
نہیں اُس کی مخلوق میں کچھ کمی
مگر اشرف الخلق ہے آدمی

○

انسان

پرندوں چرندوں میں ہیں جو حلال
ہیں انساں کے خوانِ نعمت کا مال

یہی پاک وطیّب چرند و پرند
پسندوں کی خاطر ہوئے دل پسند

وہ طائر کہ ہیں جن سے عاجز عقاب
ہوئے خوانِ انساں پہ آکر کباب

جو تیتر کہ پالی[1] میں بڑھ بڑھ گئے
مرے حکم سے سیخ پر چڑھ گئے

پٹا تھا نہ مرغے سے بھی جو بٹیر
مری دیگچی میں ہوا آکے زیر

وہ مرغا کہ تھا رات دن نغمہ خواں
مرے پیٹ میں دے رہا ہے اذاں

نباتات پس پس کے دَلیہ بنے
تو حیوان مرکھپ کے قلیہ بنے

[1] بٹیر اور تیتر کی لڑائی۔

غرض خوانِ نعمت ہے بندے کا پیٹ
ہر اک جانور قورمے کی پلیٹ
وہ بکرا کہ غم سے تھا دِل سوختہ
مرے پیٹ میں بن گیا کوفتہ
مرا طرز یکساں ہے ان سب کے ساتھ
ملاتا ہوں سب سے پلاؤ کا ہاتھ
وہ مچھلی کہ رقصاں تھی گرداب میں
وہ جل بھُن کے پہونچی مری قاب میں
تحمّل مرا دیکھ تو اے ندیم!
بنایا ہے بکری کو میں نے حلیم[1]

○

[1] مشہور غذا۔ حلیم اور کھچڑا

عید کراچی

حرارت سے حالت ہے بے حد سقیم
پلا ساقیا کوئٹے کی افیم
اگر کوئٹے سے نہ ہو دستیاب
تو پھر مالوے سے منگائے شتاب
کوئی مولوی مالوے کا ہو گر
افیم اُس سے تو مانگ لا بے خطر
یہ روزوں کی خشکی یہ فصلی بہار
حرارت کو ساقی حرارت سے مار
نہ کیوں اپنے آپے سے باہر ہو قوم
قیامت کی گرمی میں یہ ماہِ صوم
دلوں کی تپش مارتی ہے جو مے
کراچی میں فی الحال ممنوع ہے
دل و جاں نئے رنگ میں رنگ دے
مجھے مے سے مطلب نہیں بھنگ دے
بساطِ کہن پر نئے کھیل کھیل
مرے ساتھ آ۔ بھنگ پی۔ ڈنڈ پیل

نشاط و طرب کے زمانے گئے
کہ زہاد حکام مانے گئے
ہوا عید کا چاند جوں ہی طلوع
وہی عہد پُرکیف ہوگا شروع
وہی مے پرستی وہی مے پرست
وہی بزم ہوگی وہی بندوبست
اور اب بھی بہ افضالِ پیرِ مغاں
نہیں کوئی رندوں پہ بندش یہاں
حکومت کرے سخت گیری ہزار
پسِ پردہ چالو ہے سب کاروبار
بظاہر تو روزوں کا اقبال ہے
جو پردہ اٹھاؤ تو شوّال ہے
یہ بستی نہیں فی الحقیقت اُجاڑ
مثل ہے کہ تل اوٹ اوجھل پہاڑ
مہِ عید کی جلوہ پاشی کہاں
کلیدِ درِ مے کدہ ہے عیاں
عروسِ فلک کا یہ آویزہ ہے
کوئی خوانِ تقدیر کا ریزہ ہے

مہِ عید آخر تجھے کیا کہوں ؟
بھلا تجھ کو میں کس سے تشبیہہ دوں
بظاہر تری صورتِ ظاہری !
لیاقت علی خاں کی انگشتری
اُبھر اور ظالم ۔ ذرا اور اُٹھ
کسی مولوی کی عصا کا ہے مُٹھ
درخشاں بصد شان عالی ہے تو
کسی گوشِ نازک کی بالی ہے تو
امیروں کا اک آلۂ کار تو !
غریبوں کے حق میں ہے تلوار تو
وہ بے چارے بدبخت حرماں نصیب
جو اپنے وطن میں ہیں اب تک غریب
نہیں کوئی امید اُن کے لئے
محرّم مہِ عید اُن کے لئے
جو ہوں عین فٹ پاتھ پر جاگزیں
انہیں عید سے کوئی مطلب نہیں
بھلا پارہ پارہ ہوں جن کے لباس
نہ کیوں آمدِ عید سے ہوں اُداس

جو فاقہ کشی سے ہیں زار و زبوں
کلیجہ چباتے ہوں پی پی کے خوں
بھلا اُن کو اے قاصدِ ماہِ عید
تیری آمد آمد سے ہو کیا اُمید
اُتر رفعتِ آسماں سے ذرا
یہ پستی کی دنیا ہے پستی میں آ
یہ دنیا الگ ہے نہ کعبہ نہ دَیر
دکھاؤں تجھے میں کراچی کی سیر

بولٹن مارکیٹ

یہ ہے بولٹن مارکٹ اے عزیز!
یہاں آکے بکتی ہے ہر ایک چیز
زبوں بخت پیری کہ عزمِ جواں
ہر اک شے ہے جنسِ تجارت یہاں
یہاں بلبل و بوم ایک ہی صف میں ہیں
گدھا اور گدا ایک ہی صف میں ہیں
تجارت کی محمل کا ناقہ ہے یہ
فقط تاجروں کا علاقہ ہے یہ

عیدگاہ

بڑھا کر قدم دیکھ اے رشکِ ماہ
یہ ہے ایک بے عید کی عیدگاہ
کراچی نیے۔ جس سے وہ گزٹ بھی ہے
یہ شہر کراچی کا مرکز بھی ہے
سہانا سماں چاندنی چوک کا
سماں رہے یہاں چاندنی چوک کا
عجب فاقہ مستی کا فوّارہ ہے
کراچی کے بانکوں کا گہوارہ ہے
وہ لوگ اِس کے ہیں اللہ اللہ وہ لوگ
لگاتے نہیں جو کوئی دل کو روگ

جمشید روڈ

کراچی کی ہے جان جمشید روڈ
نمائش کا میدان جمشید روڈ
غضب کا مقامِ معلی ہے یہ
امیروں کا گویا محلّہ ہے یہ

لہ چالیس سال پہلے عیدگاہ کا علاقہ ہم جیسے آوارہ گردوں کا مرکز تھا اور جمشید روڈ اربابِ اقتدار کا۔

کہاں دل میں باقی شکیب اور صبر
یہیں پر ہے بابائے مِلّت کی قبر
یہاں سے اگر اور آگے بڑھیں
سڑک پر اگر جیل کی ہم چڑھیں
تو نکلیں گے رستے یہاں سے ہزار
نظر آئے گا ایک اُجڑا دیار
کہیں رفعتیں ہیں کہیں پستیاں[1]
بسائی گئی ہیں نئی بستیاں!
غرض اے مہِ عید! جا شب بخیر
دکھاؤں کہاں تک کراچی کی سیر

آرام باغ

کہاں وصفِ سرو و سمن کا دماغ
قلم آج لکھ وصفِ آرام باغ[2]
کوئی گلستاں اس کا ثانی نہیں
عجائب کا مرکز ہے یہ سرزمیں
سیاست نواز و قیادت پناہ
حریفانِ شہرت کی آماج گاہ

[1] اس زمانے میں پیر الٰہی کالونی زیرِ تعمیر تھی۔ [2] قیامِ پاکستان سے قبل "رام باغ"

کہیں کیوں نہ اِس کو بغاوت سرشت
کہ یہ باغ ہے باغیوں کی بہشت[1]
نہیں ہے تہی دست یہ خاکِ پاک
گراں قدر و پُر مایہ ہے اِسکی خاک
ٹٹولیں تو پائیں عجائب چمن
نچوڑیں تو ٹپکے کوئی انجمن
اگر اُس کے ذرّات کو دیں فشار
تو لیڈر ہو ہر ذرّے سے آشکار
برآمد ہوں گر کوئی محنت کرے
قیادت کے زیرِ زمیں مقبرے
جو تاریخ کے آج مضمون ہیں!
یہاں پر وہ احوال مدفون ہیں!
اگر اس کی عظمت کا ہو انکشاف
تو آثارِ ماضی برآمد ہوں صاف
کہیں غنڈہ گردی کے سانچے ملیں
کہیں رہ نماؤں کے ڈھانچے ملیں
کہیں کانگریس کی برآمد ہو لاش
کہیں لیگ کا پیکر پاش پاش

---

[1] قیامِ پاکستان کے بعد آرام باغ ہنگامہ خیز سیاسی اجتماعات کا مرکز بن گیا تھا۔

کہیں بزمِ احرار کی ہڈیاں
کہیں خاکساروں کا طبل و نشاں
کہیں نقش۔ نیتا[1] کی صورت ملے
کہیں اوم[2] منڈلی کی مورت ملے
سیاست کی ترمیم و تنسیخ کا
یہ دارالعجائب ہے تاریخ کا
عجب فتنہ گر اس چمن کی فضا
حوادث سے بوجھل یہاں کی ہوا
ملا اس کی کھیتی کو نعروں سے کھاد
کہیں زندہ باد اور کہیں مردہ باد!
ہے جلسوں کی جب تخم پاشی دراصل
تو کیونکر نہ کاٹیں جلوسوں کی فصل
بھلا اس کے دامن میں سبزہ کہاں؟
شب و روز اُگتے ہیں جلسے یہاں
یہ گلشن ہے یا ایک میدان ہُو
گلوں میں یہاں عطرِ فتنہ کی بُو
طلسمات ہیں جس کی پھلواریاں
وہ جادو ہیں اس باغ کی کیاریاں

---

[1] نیتا کے معنی ہیں لیڈر۔ [2] قیام پاکستان سے قبل رام باغ میں اوم منڈلی کے جلسے ہوا کرتے تھے۔ یہ ایک ہندو تنظیم تھی۔

یہاں کی نسیم ہمیشہ بہار
ہمیشہ خزاں کے لئے سازگار
بھلا رنگ و بُو کی نمائش کہاں؟
گلوں پر ہے داغ جگر کا گماں
یہ ہرگز نہیں کوئی حرفِ دروغ
کہ ہے اِس چمن میں ریا کو فروغ
ہر اِک رنگ کے انجمن ساز۔ یاں
ہر اِک رنگ کی انجمن سازیاں
نہ بلبل کا نغمہ نہ کوئل کی کوک
یہاں قلبِ لیڈر سے اُٹھتی ہے ہوک
کبھی لیگ کا گرم آوازہ ہے
کبھی اور ہی فتنۂ تازہ ہے
کبھی انجمن اہلِ تشکیک کی!
کبھی بزم اسلامی تحریک کی!
کبھی اہلِ دولت کا ہے زور شور
کبھی انقلابی مجالس کا زور
کبھی عالموں کے مواعظ یہاں
کبھی بزمِ شعر وسخن کا سماں

یہاں پر ہے ہر رنگ کا اجتماع
کبھی محفلِ نعت و بزمِ سماع
ہر اک انجمن ہیں جدا۔ اس کا طرز
کبھی شورِ تکبیر گاہے چیئرز
کراچی کا دل بلکہ روشن دماغ
غرض اک قیامت ہے آرام باغ
یہ مقیاس ملّت کے جذبات کا
عجائب کدہ ہے طلسمات کا
قلم اس کی عظمت سے ہے سرنگوں
کوئی کیا لکھے اور میں کیا لکھوں؟
بحق طلسماتِ آرام باغ!
الٰہی۔ عطا کر مجھے وہ دماغ
جو ہو اِس چمن کی طرح نکتہ خیز
سیاست کی ہنگامہ بازی سے تیز
دکھاؤں قیادت کے دنیا کو ٹھاٹ
مرے نام کر دے یہ گلشن الاٹ
نہ اِس طرح سے داغ پہ داغ دے
میں باغی ہوں یارب مجھے باغ دے

سیاست نامہ

بنام خدائے جلیل و قدیر!
خداوندِ درویش و شاہ و وزیر
وہ جس نے کہ از غایتِ لطف وجود
عدم کو بھی بخشا لباسِ وجود
وہ قادر وہ خلّاقِ بے چون و چند
کہ ہم جس کی رحمت سے ہیں ارجمند
زہے رتبۂ سرورِ انبیاؐ
حبیبؐ خدا۔ احمد مجتبیٰؐ

ارضِ پاک

نہ کیوں تیرِ غم سے ہو دل چاک چاک
کہ پٹھوں کا دنگل بنی ارض پاک
جدھر دیکھئے لوگ باچشمِ کور
اکھاڑے میں کرتے ہیں رہ رہ کے زور
سیاست کا دنگل ہے ہر سمت گرم
نہ غیرت وطن سے نہ ملت سے شرم

اڑی آنکھ سے شرم بن کر حیا
جسے دیکھئے آج ہے خود نما
کسی کو نہیں پاسِ قوم و وطن
ہر اک فرد پھاڑے ہوئے ہے کفن
جسے دیکھئے جس طرف دیکھئے
سیاہِ ہوس صف بہ صف دیکھئے
سہروردی[1] صاحب کی ہے لیگ اُدھر
اِدھر خانِ ممدوٹ عالی گُہر
بھڑک اٹھی وہ آگ تھی جو دبی
اُدھر مشرقی[2] ہیں ادھر مغربی
اگر اک طرف چند ملّت پسند
سیاسی تنزّل سے ہیں دردمند
تو ہیں ایک جانب وہ جاگیر دار
جو ہاری سے کہتے ہیں کھا مات ہار
کچھ ایسے بھی ہیں مدعیانِ دین
جو ابجد سے بھی دیں کی واقف نہیں
مگر اِس کے باوصف وہ دیں پناہ
یہ کہتے ہیں ہم ہیں فقط خضرِ راہ

---

[1] حسین شہید سہروردی اور خان افتخار حسین خاں ممدوٹ نے پاکستان مسلم لیگ سے علیحدہ ہو کر مخالف جماعتیں قائم کی تھیں۔ [2] علامہ مشرقی (خاکسار تحریک)

خطاب بہ قوم

جوانانِ عظمت نشانِ وطن!
فقط تم ہو اب حافظانِ وطن
کہو اُٹھ کے ہر پارٹی باز سے
ہر اک قائد تیز و طنّاز سے
کہ بی بلّی بخشو ہماری خطا
کہ اس سے تو چوہا لنڈورا بھلا
جو تفریق سے ہو ترقی حصول
تو ایسی ترقی ہے بالکل فضول
اگر سر پھٹوّل سے ملتا ہو تاج
تو بھیّا! نہیں چاہیئے ہم کو راج
سیاست ہے گر خانہ جنگی کا نام
تو ایسی سیاست کو اپنا سلام
سیاست اگر پارٹی باز ہے
سیاست اگر تفرقہ ساز ہے
اگرچہ نہیں لیگ میں آج دم
ہے اک مُردہ ہاتھی خدا کی قسم[1]

[1] قیام پاکستان کے بعد مسلم لیگ کا حال یہی تھا۔

مگر زندہ گیدڑ سے ہاتھی کی لاش
بہت وزن رکھتی ہے تولیں تو کاش
علاوہ ازیں جتنی لیگیں ہیں آج!
نہیں کوئی اِس قوم کی ہم مزاج
غرض یہ کہ اے مِلّتِ بے عمل
ذرا دیکھ کیا رنگ ہے آج کل
ذرا قوم کے حال پر اِک نظر
کسی کی صدا پر نہ یوں کان دھر
بہت اُن میں ایسے بھی ہیں خود پسند
کہ ڈالیں گے تیرے گلے میں کمند
تجھے کر کے آلام میں مبتلا
منائیں گے خود جشن صبح و مسا
تجھے کر کے دامِ بلا میں اسیر
بنیں گے کہیں کے سفیرِ کبیر
وزارت پہ رہتی ہو جن کی نظر
تو اِن کی قیادت کی پروا نہ کر
نہیں وقت یہ جنگ و تفریق کا
کہ دشمن ہے چوکھٹ کے اوپر کھڑا

غرض وقت کا ہے فقط یہ پیام
کہ اہلِ غرض کا نہ بن تو غلام!
جو کرنا ہے اپنے پہ کر اعتماد
نہ رکھ لیڈروں پر کوئی اعتقاد
پھنسا چاہ میں جب کہ پائیں گے یہ
کنوئیں تجھ کو کیا کیا جھنکائیں گے[1] یہ

دعائے خاتمہ

الٰہی! یہی دُھن ہے اب صبح و شام
مرے عقدِ ثانی کا کر اہتمام
میں کیوں عقدِ ثانی کو سمجھوں قبیح!
کہ ہے شیخ سعدی کا حکمِ صریح
زنِ نو کُن اے دوست! در ہر بہار
کہ تقویمِ پارینہ ناید بکار!
اگر عقدِ ثانی ہو امرِ محال
تو اے خالق و قادرِ ذوالجلال
کروں گا نہ قسمت کا ہرگز گلہ
مجھے کوئی مرکز میں عہدہ دِلا

---

[1] کنوئیں جھنکانا۔ آزمائش میں ڈالنا وغیرہ وغیرہ

وزارت کے لائق نہیں ہوں اگر
سفارت پہ مجھکو سرافراز کر

پنجاب نامہ

تاریخِ جہاں پہ ہو کے حاوی!
لکھتا ہے کچھ اِس طرح سے راوی
خوش منظر و خوش ہوا و خوش آب
اک ملک شمال میں ہے پنجاب
اللہ رے خاک پاک اُس کی
اکسیر سے بڑھ کے خاک اُس کی
جاں بخش ولطیف و روح پرور
پانی ہے وہاں کا آبِ کوثر!
کانٹے بھی نہیں فضول اُس کے
فردوس کا مول پھول اُس کے
رفتارِ نمو ہے اِس قدر تیز
بے آب زمیں بھی ہے گہر خیز
کیا خطّۂ پاک؟ کیا فضا ہے؟
فطرت کا ازل سے مے کدہ ہے

مستی ہیں اگر سحاب برسے
پانی کی جگہ شراب برسے
یہ ملک ہے کشورِ نگاریں!
فردوس سواد - خلد آئین
ہے اس کی فضا بہت سہانی
سرچشمۂ صحت و جوانی!
گر ہو کوئی پیر شصت سالہ
پنجاب میں کھا کے اک نوالہ
رستم کی طرح جوان بن جائے
لب ہلتے ہی پہلوان بن جائے
وہ چاندنی وہ نکھار وہ دھوپ
کیا رنگ ہے اس چمن کا کیا روپ؟
راوی کا بیان سن رکھو تم!
ہیں بحرِ سخا - چناب و جہلم
ادبار زدہ نہیں ہے پنجاب
اقبال کی سرزمیں ہے پنجاب
اللہ رے نسبت گرامیؔ[1]
اس نام سے ہے یہ خاک نامی

---

[1] مولانا عبدالقادر گرامی - فارسی کے نامور شاعر

ذی عظمت و ذی وقار و ذیشان
آماج گہِ ظفر[1] علی خاں
ہر رنگ میں سب کی پناہ ہے یہ
اُردو کی پناہ گاہ ہے یہ
ارباب نظر ذرا کریں غور
دلّی کا بدل ہے آج لاہور
پنجاب سے جو پھرا[2] وہ ڈوبا
منسوب ہے آپ سے یہ صوبہ
رنگیں و قوی و دل نشیں ہے
یہ زندہ دلوں کی سرزمیں ہے

آغاز داستان

یوں لکھتے ہیں راویانِ اخبار
اِس خطّۂ دل کُشا میں اک بار
ڈالا جو مصیبتوں نے ڈیرا!
ناگہ ہوا اہرمن کا پھیرا
دریائے نفاق کا تھا ناکا[3]
وہ اہرمن دیو تھا بلا کا

---

[1] ظفر الملت ظفر علی خاں مرحوم۔ [2] پھرا یعنی منحرف ہوا۔ [3] ناکا۔ مگرمچھ

کام اُس کا تھا افتراق ہر سو
نام اُس کا تھا افتراق جادو
وہ اہرمن ناگ بن کے جھوما
پنجاب کے گوشے گوشے گھوما
دیکھا کہ وہاں کے رہنے والے
ہیں سادہ مزاج بھولے بھالے
خدمت پہ وطن کی مستعد ہیں
سب لیگ کے ساتھ متحد ہیں
قائد کے پیام کے فدائی
اسلام کے نام کے فدائی
وہ آن پر جان دینے والے
اللہ کا نام لینے والے
آپس میں نہیں نفاق کچھ بھی
باہم نہیں افتراق کچھ بھی
اک رشتۂ عزم میں منظم
پنجاب ہے اک حصار محکم
باہم نہیں اختلاف کا روگ
گرویدہ ہیں دل سے لیگ کے لوگ

دیکھا جو یہ اہرمن نے عالم
وہ دیوِ سیاہ ہو کے برہم[1]
یوں زور سے ساتھیوں پہ چیخا
یوسف سے جدا ہو اب زلیخا
اٹھو صفِ اعتماد توڑ دو!
یہ قلعۂ اتحاد توڑ دو
تنظیم کو ہیچ کارہ کردو
پنجاب کو پارہ پارہ کردو
یوں قصرِ نظامِ قوم ڈھادو
ممدوٹ[2] کو لیگ سے لڑادو
جھانسا یہ دو افتخار کو تم!
بدلو گے نظامِ کار کو تم!
وہ جو ہیں شہید مردِ بنگال
ناقابلِ فہم جن کا احوال
مرشد بھی ہیں اور مرید بھی ہیں
زندہ بھی ہیں اور شہید بھی ہیں
ڈھاکے سے بلا کے ان کو لاہور
بھڑکاؤ یہ آتشِ فساد اور

---

[1] پنجاب کے پہلے صوبائی الیکشن کے موقع پر زبردست ہنگامہ برپا تھا۔ نواب ممدوٹ۔ میاں افتخار الدین، شوکت حیات اور حسین شہید سہروردی (مرحوم) مسلم لیگی امیدواروں کے خلاف صف آرا تھے۔ [2] یہ وہ زمانہ ہے کہ راقم الحروف دل و جان سے پاکستان مسلم لیگ کے ساتھ تھا۔

اسلام طلب ہے جو جماعت
معیار ہے جس کا صالحیّت[1]
کب تک یہ مصالحت کی باتیں؟
چھیڑو بھی مخالفت کی باتیں
سُن کر یہ زبانِ اہرمن سے
اِس دیوِ مخالفت کے گُرگے
اُٹھے کہ اٹھائیں اِک قیامت
دوڑے کہ جمائیں نقشِ آفت
بھاگے کہ حریف سے نمٹ لیں
جھپٹے کہ وہ لیگ کو جھپٹ لیں

معرکۂ انتخاب

اِس دیوِ منافقت نے ہر سو
پھیلا دیا کشمکش کا جادو
پنجاب ہے آج پارہ پارہ
خود کردہ را جانِ من چہ چارہ
ہر سمت ہے زور آزمائی
بھائی پہ جھپٹ رہا ہے بھائی

[1] جماعت اسلامی

اِس جنگ کا ماجرا عجب ہے
کیا قہر ہے آہ کیا غضب ہے؟
اِس وقت ہے جنگ کی یہ صورت
ہے لیگ کے ساتھ اکثریّت
ہر چند کہ ہو چکی ہے باسی
یہ لیگ ہے اصلی و اساسی
اور اُس کی عدو بہ حکمِ عقلی
اک اور ہے لیگ جو ہے نقلی
دیکھے تو کوئی یہ شورہ پشتی
اب اصل کی نقل سے ہے کُشتی
پیکار کا کر کے استخارہ!
میدان میں لیگ ہے صف آرا
اِس فوج کے قلب میں ہیں محکم
خود تیغ بکف وزیرِ اعظم[1]
پیکارِ عمل کی جی میں ٹھانے
الفاظ کے لے کے توپ خانے
لشکر کے قدم گڑے ہوئے ہیں
قائد کے علم گڑے ہوئے ہیں

[1] لیاقت علی خاں مرحوم

پھٹتا ہے میانِ جنگ ہر دم
تقریر و بیان کا ایٹمی بم
بارش ہے اگر نوازشوں کی
بارود بچھی ہے سازشوں کی
اِس فوج جری کا کیا ٹھکانہ
خود میمنے پر ہیں دولتانہ[1]
اور میسرے پر جناب صوفی
ہے سامنا جن کا بے وقوفی
میدان میں لے شہید کی اوٹ
اک فوج کے رہ نما ہیں ممدوٹ
ممدوٹ کی فوج پیشہ ور ہے
ہر شخص کی لوٹ پر نظر ہے
جرنیل بہت جوان کمتر
ہتھیار ہیں اِن کے کند اکثر
ممدوٹ کی صف سے بالا بالا
چھوٹا سا ہے اور اک رسالہ
اللہ رے اُس کی شیر مردی
ڈالے ہوئے تن پہ سرخ وردی

---

[1] قیام پاکستان کے بعد پنجاب میں پہلے صوبائی الیکشن بڑے ہنگامہ خیز تھے۔ پاکستان مسلم لیگ کی قیادت میاں ممتاز دولتانہ اور ان کے رفیق کار صوفی عبدالحمید کر رہے تھے ان کے مقابل نواب افتخار حسین ممدوٹ، حسین شہید سہروردی، میاں افتخار الدین مرحوم اور جماعت اسلامی کے امیدوار صف آرا تھے۔

ممدوٹ سے گو ہٹا کھڑا ہے
میداں میں مگر ڈٹا کھڑا ہے
اِس دستے کا وقت جنگ و پیکار
سالار ہے افتخارِ پُر کار،

اک گوشۂ جنگ میں بہ حکمت
صف بستہ ہیں صالحین اُمّت[1]
گنتی کے ہیں اِن میں گو سِلح شور
لیکن دمِ جنگ سخت پُرزور

ہاتھوں میں ہیں اِن کے کچھ رسالے
تاریخِ سلف کے کچھ حوالے
تسبیح بکف عمامہ برسر
یہ فوجِ خدا ہے جلوہ گستر

بیٹھا ہے جو دل میں لیگ کا ہول
پڑھتے ہیں یہ بار بار لاحول
اسلام کے واسطے بڑھے ہیں
اِس لام پر مولوی چڑھے ہیں

القصہ یہ ہے بہ شرح و اطناب
اِک نقشہ سرزمین پنجاب

---

[1] جماعت اسلامی کے امیدوار — میاں افتخار الدین مرحوم ترقی پسند گروپ کی قیادت کر رہے تھے۔

لندن سبھا

پلا ساقیا بادۂ شوخ و شنگ
کہ بندے کو لکھنا ہے حالِ فرنگ
وہ مے دے مصفّا و پُر جوش و ناب
کہ آنکھوں سے غفلت کے اُٹھیں حجاب
وہ مے دے طرب ریز و پُر کیف و تیز
کہ محفل پکارے بیار و بریز
وہ مے دے مجھے ساقیا بے درنگ
کہ لندن کا جم جائے آنکھوں میں رنگ
وہ لندن جہاں لے کے اِک بیکلی
گئے تھے جنابِ لیاقت علی
وہ لندن کہ ہے قبلۂ رہبراں
وہ لندن کہ ہے منزل لیڈراں
وہ غارت گرِ صبر و ضبط و شکیب
کلیسائے تزویر و مکر و فریب
وہ لندن کہ چرچل کی ہے جلوہ گاہ
شہنشاہیت کی کہن خانقاہ

لہ لیبر گورنمنٹ کے وزیرِ اعظم مسٹر اٹیلی نے لندن میں کامن ویلتھ وزراءِ اعظم کی کانفرنس طلب کی تھی۔

غلامی کا منحوس سازش کدہ
وہ آزاد اقوام کا مقبرہ
نہ لُو نام اُس کا خدا کے لئے
کمیں گاہِ ظلم۔ ایشیا کے لئے
بظاہر وہ احرار کی انجمن
مگر حریت دشمنوں کا وطن
بظاہر وہ دنیا کی جائے پناہ
بباطن وہ بازارِ جرم و گناہ
پلا ساقیا پے بہ پے دمبدم
اِسی شہر لندن کی تجھ کو قسم
کہ لکھنی ہے مجھ کو بحُسن داد
نئی مثنوی یعنی لندن سبھا

آغازِ داستان

سنا ہے کہ لندن پہ ہے حکمراں
کوئی اِک وزیر قیادت نشاں
بظاہر وہ عالی گہر ہے وزیر
حقیقت میں قیصر صفت جم نظیر

وہ ایسا سکندر ہے بے تخت و تاج
کہ شاہانِ عالم سے لیتا ہے باج
سلاطینِ دنیا کا ہے حکمراں
جہاں میں اُسی کا ہے سکّہ رواں
خطابوں سے کیا اس کے واقف کوئی
کہ نام اُس کا مشہور ہے اٹیلی
یہاں سے یہ کلکِ صداقت بیاں
ہے یوں صفحۂ نظم پر گُل فشاں
کہ یہ اٹیلیؔ وزارت پناہ
ہمارا بھی ہے حاکم و بادشاہ!
سُنی اٹیلی نے جو اِس کی بھنک
لیاقت علی خاں کو ہے کچھ جھجک[1]
غلط ہے کہ آنے کی رائے نہیں
مگر ہاں وہ لندن میں آئے نہیں
تو انکار اُن کا بتا کر غلط
لکھا اٹیلی نے لیاقت کو خط

---

[1] لیاقت علی خاں مرحوم نے اعلان کیا تھا کہ جب تک مجوزہ کامن ویلتھ کانفرنس میں مسئلہ کشمیر زیر بحث نہ آئے گا۔ وہ کانفرنس میں شرکت نہ کریں گے۔ لیکن بعد کو وزیر اعظم اٹیلی کے اصرار پر مرحوم نے اپنے موقف کو ترک کر دیا اور کامن ویلتھ کانفرنس میں شرکت کے لئے روانہ ہو گئے۔

اٹیلی بنام لیاقت

عزیز و رفیقِ سعادت نہاد
بہ فضلِ خدا۔ عمر و دولت زیاد
سراپا اطاعت سراپا سپاس
فرنگی سیاست کے نکتہ شناس
تمہارے لئے حق سے ہے روز و شب
دعائے درازیٔ عقل و ادب!
تعجب کہ تم سا عقیدت شناس
بہ ایں عقل و تدبیر و ہوش و حواس
جو ہو کعبۂ عجز میں معتکف
وہ یوں راہِ اخلاص سے منحرف؟
غلط کاریاں آہ تدبیر کی!
تمہیں فکر ہے صرف کشمیر کی
سمجھتے نہ تھے سنگ دل تم کو ہم
نہیں تم کو آقائے نعمت کا غم
کرو یوں نہ کشمیر پر قیل و قال
ہمارے مقاصد کا رکھو خیال

تمہیں فکر اپنی کم و بیش ہے
یہاں تیسری جنگ درپیش ہے
سنو اپنے آقائے نعمت کا حکم
سنو پھر سنو بدولت کا حکم
نہیں اور اِس کے سوا کچھ کلام
کہ لندن کا اب رُخ کرو والسلام

خاتمۂ کلام

جو پہونچا۔لیاقت علی کو یہ خط
ہوا سارا نقشہ۔ عمل کا غلط
نہ تھی اُن میں ہرگز یہ تاب و مجال
کہ آقا سے کرتے جواب و سوال
پہونچتے ہی نامہ انہوں نے کہا
خدا بخش اٹھ میرا بستر اٹھا
مٹی ۔ دل میں تھی جس قدر کھلبلی
چلے سوئے لندن ۔ لیاقت علی

خطاب بہ ساقی

پلا ساقیا شربتِ برف و قند
کہ شعلے ہیں مینائے مے سے بلند
مےِ آتشیں سے بھڑکتی ہے آگ
چمکتی ہے بجلی جو اُڑتے ہیں کاگ
دکھائیں گے کیا رند جوش و خروش
پسینے پسینے ہیں خود مے فروش
کوئی ایسی گرمی میں کیا ہو سُکھی؟
ہر اک خُم ہے گویا جوالا مُکھی!
گماں مے کدے پر جہنّم کا ہے
اُبلتا ہے لاوا کہ بہتی ہے مے
کڑی دھوپ ارض و سما کی تپش
غضب کی حرارت بَلا کی تپش
یہ سوداویت اور جوشِ جنوں!
نہیں ایک لمحے کو حاصل سکوں
بھروسا نہیں زیست کا الاماں
ہیں بے[1] ساکھ یہ جیٹھ کی گرمیاں

[1] بیساکھ موسم گرما کا ایک مہینہ بھی ہے ۔ بے ساکھ کے معنی ہیں بے اعتبار ۔

سُلگتے ہیں اعضا بھڑکتا ہے خون
مئی نے بدل لی ہے دوزخ کی جُون
غضب ناک سورج کا نظّارہ ہے
دہکتا ہوا جیسے انگارہ ہے!
یہ جنّات کے سانس ہیں یا ہوا
یہ تپتی زمیں جیسے جلتا توا
بھلا ایسی گرمی میں اے گرم جوش
کسے بادۂ شعلہ پرور کا ہوش؟
برانڈی نہ وہسکی نہ جن چاہیے
مجھے تو بیئر رات دن چاہیے
نہ اب دعوت بادۂ ناب دے
کئی دن سے تشنہ ہوں برفاب دے
حریفان بادہ کو بادہ پلا!
مجھے تو فقط آب سادہ پلا!
نہ دے میرے سر کی قسم یہ جواب
گراں تر کراچی میں ہے مے سے آب
گلہ تشنہ کامی کا دشمن کریں!
ہمیں کیا اگر لوگ پیاسے مریں

نہ دے گرم جوشی کی مجھ کو نوید
کہ اِس سال گرمی ہے بے حد شدید
یہ آتش مزاجی نہیں برمحل
حکومت کی دیرینہ حکمت پہ چل
نہ کر گرمیٔ بزم کا اہتمام
فقط سرد مہری سے چلتا ہے کام
قیامت ہیں گرمی کے لیل و نہار
زمیں و زماں کو چڑھا ہے بخار
اُڑے دھوپ میں کیوں نہ سب رنگ روپ
کہ تپ کر جہنّم سے نکلی ہے دھوپ
کراچی کے یہ چھوٹے چھوٹے مکاں
جہنّم کدے یا سَقر آشیاں!
دَر و بام شعلے اُگلتے ہوئے
حرارت سے حدّت سے جلتے ہوئے
اِن آتش کدوں میں بحالِ تباہ
تڑپتے ہیں غربت کے زندہ گناہ
مگر اِن کی پروا نہ کر اے عزیز
کہ اہلِ حکومت کی چڑ ہے یہ چیز

جو شیوہ حکومت کو ہو ناپسند
یقیناً وہ ہے باعثِ قید و بند
چلے گا نہ کوئی فسوں ساقیا
اگر سیفٹی ایکٹ میں دھر لیا؟
خطر ہی خطر ہے بس اِس کھیل میں
نہ سڑ جائیے تو سنٹرل جیل میں

دربارۂ احوالِ زمانہ

کہوں تجھ سے کیا ساقیٔ سادہ دل
کہ سوزِ دروں سے ہے جی مضمحل
اُدھر خاکِ دل میں بھبک راکھ کی
اِدھر گرمیاں جیٹھ بیساکھ کی
جدھر دیکھیے شعلہ انگیز ریت
اِدھر گولیمار[1] اور اُدھر لالوکھیت
نہیں چارۂ تشنگی اپنے پاس
بجھے کس طرح تشنہ کاموں کی پیاس
زلالِ نشاط آج نایاب ہے
نہ پانی نہ شربت نہ برفاب ہے

[1] گولیمار یعنی گل بہار - لالوکھیت یعنی لیاقت آباد

وہ احوال ہے جس کا ثانی نہیں
سمندر قریب اور پانی نہیں!
مقدّر سے ہیں جن قلیٹوں میں نل
سدا سے ہے بگڑی ہوئی اُن کی کل
ٹپکتے ہیں اِس طرح قطراتِ آب
برستا ہے جس طرح خالی سحاب
نہ کیوں سر کو ٹکرائیں آنکھوں کو موند
کہ حصّے میں آتی ہے اک آدھ بوند
رہے کس طرح دل میں پاکیزہ پن
طہارت بھی مشکل وضو بھی کٹھن
نہانے کا ایسے میں ہے کیا سوال
یہاں غسلِ میّت ہے اَمرِ محال
یہ حالت ہے ان کی جو بستی میں ہیں
جو باہر ہیں وہ اور پستی میں ہیں
مضافات میں ہیں جو آبادیاں
وہ آبادیاں ہیں کہ بربادیاں
بشر ہے وہاں خس سے کم قدر تر
بنائے ہیں تنکوں نے تنکوں کے گھر

نشیمن ہے چڑیا کا ہر جھونپڑا
چھنیں جس طرح چیل کا گھونسلا!
بنا ہے ہر اک شخص جوگی وہاں
کہ ہیں جھونپڑوں کا لقب جھگیاں
ٹلے ان غریبوں سے کیوں کر۔ بلا
کہ ہر گام پر ہے نئی کربلا
بسے ہوں جہاں تشنہ لب صد ہزار
وہاں ایک نل وہ بھی دق کا شکار
عجب طرح پائپ ہیں قطرہ فشاں
کہ بلبل کے ہوں اشک جیسے رواں
جو چھیڑو تو پُر آب ہوتا ہے وہ
چلاتے ہیں اُس کو تو روتا ہے وہ
ہے افسانۂ نل دمن برمحل!
کہ پانی دمن اور پائپ ہے نل[1]
ہے ان ریگ زاروں میں لُو کا وہ حال
جہنم میں آیا ہو جیسے اُبال
یہاں کا بیان۔ کدورت مدار
بجا ہے لکھوں گر بخطِ غبار

---

[1] نل دمن کی مشہور عاشقانہ مثنوی۔

جو ملتی ہے ریگ بیاباں بھبھوت
نظر آتے ہیں آدمی زاد بھوت
ہوا سے اُلجھتی ہے اٹھ کر جو گرد
تو ہر کوچہ بنتا ہے دشتِ نبرد
یہ رو رو کے کہتا ہے قلبِ ملول
یہاں کیا دھرا ہے فقط خاک دھول
سَرِ شام جب گندگی سے بھرے
گذرتے ہیں ڈنگر پرے کے پرے
خدا کی قسم دیکھ کر گرد باد
نظامی کا آتا ہے وہ شعر یاد
زسم ستوراں دراں پہن دشت[1]
زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت
غرض اے مرے ساقیٔ پاک زاد
سراسر یہ بستی ہے خاکی نژاد
کراچی کی ریت اور کراچی کی رُت
بنا دے گی انساں کو مٹی کا بُت
سنا تھا کہ یہ شہر ہے معتدل
مزاج اِس کے موسم کا ہے مستقل

---

[1] نظامی کے شعر کا مفہوم یہ ہے کہ میدانِ جنگ میں گھوڑوں نے اتنی گرد اڑائی کہ زمین کے طبق چھ گئے اور آسمان کے آٹھ ہو گئے۔

اگھن پوس میں برف گلتی نہیں
جو گرمی پڑے لُو کی چلتی نہیں[1]
مگر ہم کو جب سے پڑا سابقہ
یہی تجربہ رفتہ رفتہ ہوا
جو سرما میں قطب شمالی ہے یہ
تو گرما میں دوزخ مثالی ہے یہ

خاتمۂ کلام

اب اے دل! نہ آتش بیانی دکھا
نہ لفظوں کی شعلہ فشانی دکھا
بہت ہو چکا گرمیوں کا بیاں
دکھائیں قلم نے بہت گرمیاں
طبیعت جو یک ٹُٹ چلی اِس گھڑی
تو جھٹنے لگی نظم کی پھُل جھڑی
خدا کے لئے رَخشِ خامہ کو روک
جو کہنا ہے ظالم وہ کہہ دے دو ٹوک

[1] لُو کی نہیں چلتی۔ یعنی لُو من مانی نہیں کرسکتی۔

الٰہی! بحقِ لیاقت علیؒ[1]
کھلا میرے دل کی فسردہ کلی
یہاں کی ڈھکا پیل سے دور رکھ
مجھے سنٹرل جیل سے دور رکھ
جلوسوں سے نعروں سے چندے سے دور
رہے سیفٹی ایکٹ بندے سے دور
الٰہی! بحقِ وزیرانِ قوم!
نہ آئے مرے گھر کبھی ماہِ صوم
کوئی ترکِ عادت کی صورت نہ ہو
مجھے روزہ داری کی عادت نہ ہو
ادا کر دیا ہم نے تو اپنا فرض
یہ ہے قارئینِ گرامی سے عرض
عمل کی ہو توفیق انہیں صبح و شام
یہ عاجز تو ہے بے عمل والسلام
نوشتہ بماند سیہ بر سفید
نویسندہ را نیست فردا امید

[1] وزیر اعظم پاکستان لیاقت علی خان۔

جہاد نامہ

طبیعت ہے عرصے سے رندوں کی کُند
پلا ساقیا! بادۂ تیز و تند
وہ مے جس میں زہر اور لہو کا مزہ
وہ مے جس میں خونِ عدو کا مزہ
وہ مے جس کی گرمی ہو مینا گداز
وہ مے عزم پرور شجاعت نواز
وہ مے جس میں رقصاں ہو روحِ جہاد
وہ مے ۔ مے کدہ جس کا پائندہ باد
جو ہجرت میں پالی گئی ہے وہ مے
عرب میں جو ڈھالی گئی ہے وہ مے
اُسے ربط کیا خوشۂ تاک سے
یہ مکّے میں اُتری ہے افلاک سے
وہ مے جس کا ساقی خدا کا حبیبؐ
وہ نصرٌ من اللہ فتحٌ قریب
جو مکّے میں سب کو چکھائی گئی
جو بدر و احد میں پلائی گئی[1]

---

[1] اگست ۱۹۵۱ء میں ہندوستان و پاکستان کے درمیان حالتِ جنگ پیدا ہو گئی تھی۔

صحابہؓ نے بزمِ پیمبر میں پی
علیؑ نے جو میدانِ خیبر میں پی
وہ مے جو مجاہد کی ہے آرزو
وہ مے جس کا پیغام ہے جاھدو[1]
وہی مے وہی مے وہی مے وہی
پلا ساقیا شوق سے اور پی
کہ دشمن نے مانگا ہے میدانِ جنگ
لگائے ہیں سرحد پہ توپ و تفنگ
سُنا ہے کہ اِک بچّۂ برہمن
مبارز طلب صورتِ اہرمن!
حوادث کی ضربوں سے ہو کر نڈھال
ہوا ہے صف آرا بہ عزمِ قتال
یکایک مچائے نہ کوئی فساد!
کمر باندھ ساقی برائے جہاد!
نہ اب بادۂ عیش تاثیر دے
بجا طبلِ جنگ اور شمشیر دے

---

[1] قرآن مجید کا حکم ہے جاھدو۔ یعنی کفار و مشرکین سے جہاد کرو۔

راول پنڈی نامہ (شہادتِ قائدِ ملت لیاقت علی خاں)

نہیں کیف و مستی کا رندوں میں دم
پلا ساقیا! آج زہرابِ غم
وہ تلخ آبۂ زہر دے پے بہ پے
کہ مسموم ہو جائے خود جامِ مے
وہ افشردۂ تاک ہیں زہر گھول:
کہ بادہ پرستوں کی کھل جائے پول
جو بے ذوقِ حکمت ہیں اب ان کو سانٹھ[1]
ہر اک موج مے ہیں وہ بھر بس[2] کی گانٹھ
کہاں منظرِ مے کشی وجہِ رشک
کہ آنکھوں ہیں امڈا ہے طوفانِ اشک
کلیجہ ہے خود سوزِ غم سے کباب
ٹپک دے گلابی بہا دے شراب
مے انجامِ مے سوچ کر پھینک دے
بطِ مے کے پر نوچ کر پھینک دے
دلاسا نہ دے قلبِ رنجور کو!
بٹھا سوگ میں بنتِ انگور کو

---

[1] سانٹھ لینا۔ پھانس بنانا [2] بس کی گانٹھ۔ زہر کی پڑیا۔ زہریلی بوٹی۔

فقط سینہ کوبی میں ہے غم سے چھوٹ
صراحی کے سینے کو ساغر سے کوٹ
سُبو سر اٹھائے تو سر پھوڑ دے
جو بولے تو بوتل کا مونہہ توڑ دے
جو دُہرائے پیمانِ مے اپنے آپ
تو پیمانۂ مے کی گردن کو ناپ
بس اب دخترِ رز کو نظر بند کر
خُمستانِ عشرت کے در بند کر
طرب کا ہر اک سلسلہ توڑ دے
کلیدِ درِ مے کدہ توڑ دے
کہاں شورِ قلقل میں وہ کیف و حال
بلا نوش ہیں نیشِ غم سے نِڈھال
جو ہیں گردشِ بخت سے سرگراں
شمارِ طرب اُن کے بس میں کہاں؟
پسند آئے گی کس کو متلی ہے مے
قرابے کی بُو سے بھی آتی ہے قے

یہ ہے منظر بادۂ لالہ گوں!
کہ جوشاں ہو جس طرح سیلابِ خوں
گلابی کا رنگیں سماں دیکھ کر
نگاہوں میں پھرتے ہیں زخمِ جگر
کچھ اس طرح بادہ چکاں ہے سبو
کسی گھاؤ سے جیسے ٹپکے لہو!
ہے اس طرح ساغر میں صہبا کی لہر
تپاں جس طرح نیشِ کژدم میں زہر
ہیں یوں شورِ قلقل میں آہیں نہاں
دمِ واپسیں جس طرح ہچکیاں
فسردہ ہیں یوں بادہ کش ہر طرف
کہ جیسے کوئی سوگواروں کی صف
کہاں ساقیا! اب وہ بزمِ نشاط!
کہ گردوں نے الٹی طرب کی بساط
چمن میں ہے عہدِ بہاراں کا سوگ
یہ خانِ لیاقت علی خاں کا سوگ

خمستانِ ملّت کے پیرِ مغاں!
لیاقت علی خانِ عظمت نشاں!
وہ ساقیٔ صہبائے عزم و عمل
وہ بابائے[1] ملّت کا نعم البدل
وہ جانِ وفا — زندگی کی قسم
مجسم لیاقت — علیؑ کی قسم
سیاست کا پیکر تدبّر کی رُوح
وہ جسمِ عمل ہیں تفکّر کی رُوح
وطن کے لئے لائقِ فخر و ناز
لیاقت پسند و لیاقت نواز!
بہت سرد مہر اور بڑے گرمجوش
وہ خلوت نشیں اور ہنگامہ کوش
طبیعت کے نازک مثالِ حریر
مگر نظم و تدبیر میں سخت گیر
وہ طعن و ملامت کے تنہا ہدف
مگر قوم مائل اُنہیں کی طرف
وہ اِس قوم کے قبلہ گاہِ اُمید
وہ ملّت کے شاہد وہ قومی شہید

---

[1] بابائے ملّت۔ قائدِاعظمؒ

ہوئی لیگ[1] کی جب کہ تنظیم نو
یہ تھے لیگ کے ناظمِ تیز رَو
کبھی یہ یہاں تھے کبھی یہ وہاں
غرض چھان ڈالا تھا ہندوستاں
یہ ظاہر تھا اِس حملۂ تیز سے
کہ سازش تھی ہندو کی انگریز سے
وہ ہندو کہ تنظیم کا دیوتا!
وہ انگریز جو حاکم عہد تھا
جو بے چارے مسلم سے دِہ چند تھیں
وہ فوجیں مقابل ہیں صف بند تھیں
حوادث میں ملّت کے اہلِ صلاح
فقط اِک لیاقت فقط اک جناح
مسلسل لڑائی پہ باندھے کمر
یہ دو تھے اِدھر اور لاکھوں اُدھر
مگر آج تاریخ خود ہے گواہ
مقابل سے بھاگی مخالف سپاہ
جمے اور حد سے بھی زائد جمے
لیاقت جمے اور قائد جمے

---

[1] آل انڈیا مسلم لیگ کی تنظیم جدید قائداعظم کی قیادت میں ۱۹۳۴ء میں ہوئی تھی اور لیاقت علی خان کو جنرل سیکریٹری منتخب کیا گیا تھا۔

مگر ایسے عالم میں بھی ہم نشیں!
لیاقت پہ تھے فتنہ گر نکتہ چیں
کبھی اِن پہ مہمل ارادے کی طعن
کبھی ان پہ نوّاب زادے کی طعن
کبھی اُن کے اطوار پہ اعتراض
کبھی اُن کے کردار پر اعتراض
کہیں سرخ پوشانِ ناداں سے تھے
کہیں قوم پرور مسلماں سے تھے
کہیں خاکسارانِ آتش نہاد
جناح و لیاقت سے گرمِ فساد
یہ نقشے بنے اور بگڑتے رہے
لیاقت مگر سب سے لڑتے رہے
بالآخر ہوئی رحمتِ حق رفیق
کہ رَن چھوڑ بھاگا مخالف فریق
حریفوں کے ہونٹ اور پھرا بندھا
اِدھر کامیابی کا سہرا بندھا

کوئی ان کی تدبیر سے مضمحل!
کوئی ان کی تقدیر پر مشتعل
سیاست سے قطع نظر بعض لوگ
لگا تھا جنہیں بغض و نفرت کا روگ
خدا کا غضب دیکھئے وہ شریر
ہوئے اُن کے ناموس پر حرف گیر[1]
کوئی ان کی عزّت پہ تھا طعنہ زن
کبھی ان کے اطوار سے سوءظن
بہت بدگماں تھا کوئی اہل رائے
کوئی ان کو کہتا تھا اِک شو بوائے
یہ کہتا تھا اک مفتیٔ مفت خور
لیاقت کو معزول کردو بزور
نہیں لائق رہبریٔ وطن!
یہ اسلام دشمن یہ مِلّت شکن
کسی قاضیٔ بے قضا کا خیال
لیاقت ہے ملّت کے حق میں وبال

---

[1] مرحوم لیاقت علی خاں اور اں کی بیگم کے خلاف سیاسی اور مذہبی رجعت پسندوں نے بڑی شرمناک مہم شروع کر رکھی تھی اور ان کے کردار پر طرح طرح سے بے بنیاد نکتہ چینی کی جاتی تھی۔

سدا جس کے سر میں ہو یورپ کا خبط[1]
بھلا اُس کو اسلام سے کیا ہو ربط
کوئی مولوی ولایت پناہ
یہ کہتا تھا۔ ہر دم بہ فریاد و آہ
کریما بہ بخشائے بر حال ما
لیاقت کے پنجے سے ہم کو بچا
مگر یہ لیاقت کا تھا حوصلہ
نہ ابرو پہ بل تھے نہ لب پر گلہ
مخالف کو جب دیکھ پاتے تھے وہ
تو کس لطف سے مسکراتے تھے وہ
کبھی حاسدوں کا جو آتا تھا ذکر
تو کہتے تھے بیکار ہے اِس کی فکر
کبھی نکتہ چینیوں سے لڑتے نہ تھے
کسی بات پر وہ بگڑتے نہ تھے
جو چھڑتی تھی اِن اعتراضوں کی بات
تو کہتے تھے سب پوچ سب واہیات

---

[1] تنگ نظر ملاؤں نے قائدِ ملت اور ان کی شریکِ حیات پر مغرب زدگی، نواب زادگی اور بدکرداری کے لیسے لیسے جھوٹے الزام عائد کئے تھے کہ خدا کی پناہ۔ وزیرِ اعظم نے کبھی اِس نکتہ چینی کا نوٹس نہیں لیا۔

میں اِس نکتہ چینی سے ڈر جاؤں گا؟
کبھی وقت آیا تو مر جاؤں گا
جو خطرے میں ہو قوم کی آبروؔ[1]
"لیاقت کا پہلے بہے گا لہو"
کبھی جان دینے سے ڈرتے نہیں
کہ ہم لوگ بستر پہ مرتے نہیں
عدو طعن کی بولیوں کے لئے
جگر ہے مرا گولیوں کے لئے

حادثۂ خونچکاں

یہ عالم ہے خونی حکایات سے
اُبلتا ہے خون چشمِ داوات سے
یہ روداد ہے اسقدر دردناک
قلم وقتِ تحریر ہے سینہ چاک
مصائب کا کچھ اِس قدر جوش ہے
ہر اِک حرفِ غم سے سیہ پوش ہے

[1] وزیرِ اعظم مرحوم نے اپنی آخری تقریر (۲۴ اگست ۱۹۵۱ء جہانگیر پارک) میں اعلان کیا تھا کہ پاکستان پر آنچ آنے کی تو سب سے پہلے میرا خون بہے گا۔

ہر اک سطر ۔ خطِّ غمِ ہیکراں !
تو کاغذ پہ گویا کفن کا گماں
لکھ اسے خامۂ خونچکانِ ام !
لیاقت علی خاں کی رُوداد غم
وہ تیرہ محرم[1] کی خونیں سحر
وہ قائد کا پنڈی کی جانب سفر
سہ شنبہ ۔ نحوست کا یکسر محل
وہ منگل کا دن زحل کا وہ عمل
وہ عزمِ شہادت کی تیاریاں
شبِ قتل ۔ قائد کی بیداریاں
فضاؤں میں انجان سی تیرگی
اندھیرے میں رونے کی آواز سی
در و بام ویراں ۔ ہوائیں ملول
فلک سے بلاؤں کا پیہم نزول
وہ قصرِ وزارت کا غمگیں سماں
لیاقت کے ماتم کی تیاریاں
وہ اشرف[2] کا کہنا بہ دردِ جگر
کہ بابا مناسب نہیں یہ سفر

---

[1] ۱۳ ر محرم ۔ منگل ۱۶ ر اکتوبر ۱۹۵۱ء [2] قائد ملّت کے فرزند اکبر۔

کراچی پہ حسرت سے کرکے نگاہ!
لیاقت کی رخصت سوئے قتل گاہ
وہ پنڈی[1] وہ پنڈی کی خونیں زمیں
کہ مرکز ہے سب سازشوں کا وہیں
جلن ہو نہ کیوں قلبِ پُر داغ ہیں
وہ اجلاسِ غم کمپنی باغ ہیں
وہ قاتل[2] وہ اِس قتل کا بندوبست
صفِ اوّلیں ہیں وہ اُسکی نشست
وہ قائد کی آمد بصد احتشام
وہ آغازِ خطبہ برائے عوام
وہ انواع و اقسام کی بولیاں
وہ بدبخت قاتل کی دو گولیاں
وہ قائد کا گرنا بروئے زمیں
وہ قاتل کا خود ڈھیر ہونا وہیں
وہ قائد کا کہنا کہ ہم تو چلے
"خدا۔ اس زمین[3] کی حفاظت کرے"

---

[1] پہلے راولپنڈی سازش کیس کے بعد پھر سازش قتل لیاقت۔ [2] سید اکبر قاتل۔ جسے اخفائے سازش کے لئے برسرِ جلسہ گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا تھا۔ [3] سینے پر گولی کھانے کے بعد قائد ملت کی زبان سے بے ساختہ نکلا تھا۔ خدا پاکستان کی حفاظت کرے۔

وہ قاتل وہ عہدِ رواں کا یزید
وہ غازی ۔ بنام حسین شہیدؑ
مذاقِ شہادت کو گرما گیا
محرّم اثر اپنا دکھلا گیا

خاتمہ و دعا

زبان روک اے خامۂ دل فگار!
کہ محفل میں ہر شخص ہے اشک بار
غمِ ہجر ہے لاکھ حد سے زیاد
یہ غل ہے لیاقت علی زندہ باد
دعا ہے یہ درگاہِ ربِّ کریم
کہ وہ جنّتِ خُلد میں ہو مقیم
عطا ہو ہمیں اُس کے ماتم میں صبر
زیارت گہِ خلق ہو اس کی قبر
رہے زندۂ جاوداں اُس کا نام
یہ ملّت رہے کامراں والسلام

پروڈانامہ

دولتِ ہوش پر پڑا ڈاکہ
ذکر جب چھڑ گیا پروڈا کا

یہ پروڈا[1] ہے وہ بلائے سیاہ
[illegible] جس کا نہیں خدا کی پناہ

حکمراں کو گدا بناتا ہے!
آدمی کو گدھا بناتا ہے!

چھین کر تاج کج کلاہوں سے
باج لیتا ہے بادشاہوں سے

اللہ اللہ یہ فتنۂ پُرفن
یہ بلائے سیاہ وہ ناگن

احمقوں کو دلیر کرتی ہے
یہ وزیروں کو زیر کرتی ہے

چڑھ کے خود کھیلتی ہے کالوں پر
چوٹ کرتی ہے ناک والوں پر

---

[1] حکومت پاکستان نے صوبائی اور مرکزی وزراء کے محاسبے کے لئے پروڈا کے نام سے ایک قانون نافذ کیا تھا۔

لاکھ ہو کوئی جھاڑ پھونک میں طاق
کچھ نہیں اِس کے زہر کا تریاق
یہ پروڈا عجب چھلاوا ہے
سیفٹی ایکٹ کا بھی باوا ہے
گو ہمہ گیر ہے یہ آج وبا!
دَور دورہ ہے سندھ میں اِس کا
پیش و پس گو کہیں نہیں اِس کو
راس آئی ہے یہ زمیں اِس کو
یہ پروڈا۔ کہ ہے نیا قانون
بن گیا ہے وزارتی طاعون
جب کھُڑو[1] پر چڑھا یہ مارِ سیاہ
ہٹ گئے سامنے سے فضل اللہ
اِس کی میری کے معترف میراں
تالپور اِس کی تال پر رقصاں
سندھ کے جس قدر ہیں اہلِ حشم
کھائے جاتا ہے اُن کو اِس کا غم

---

[1] سندھ کا حکمراں طبقہ محمد ایوب کھُڑو مرحوم۔ قاضی فضل اللہ مرحوم۔ میراں محمد شاہ مرحوم، و میر غلام علی تالپور مرحوم سب اِس قانون کی زد میں تھے۔

دعائے وزرائے سندھ

یہ دعا مانگتے ہیں شام و سحر
اے خدائے بزرگ اے داور!
اے کہ تیرا کرم ہے خلق پہ عام
تو بناتا ہے سب کے بگڑے کام
دشمنوں نے لگائے ہیں لاسے[1]
شرفا کو بچا پروڈا سے
اے خداوندِ انفس و آفاق!
زہرِ آفات کو بنا تریاق
شرع و آئین کے تصدق میں
ناظم الدین[2] کے تصدق میں
آنچ آئے نہ جاہ و حشمت پر
مستقل رکھ ہمیں وزارت پر
یہ ستم گر نہ کوئی آفت ڈھائے
ڈنک اِس کالے ناگ کا گل جائے
بہ طفیل گورنرانِ جلیل!
دشمنانِ منسٹری ہوں ذلیل

---

[1] لاسے۔ جال۔ پھندے۔ [2] خواجہ ناظم الدین گورنر جنرل پاکستان۔

لے کے قانونِ مملکت کی پناہ
سب کے پیچھے پڑے ہیں یہ بدخواہ
چند گستاخ چند بد کردار!
جن کے کردار پر خدا کی مار
جن کی عسرت تونگری کی سوت
جن کی تقدیر میں نہ رزق نہ موت
جو سب اہلِ حشم سے جلتے ہیں
مختصر یہ کہ ہم سے جلتے ہیں
گو تھے خود بھی حسد سے دیوانے
اور بھڑکا دیا پروڈا نے!
یہ کمر کس کے بہر جنگ و جدال
وزراء کے لئے بنے ہیں وبال
جب منسٹر ذرا اُبھرتے ہیں
یہ پروڈا کا وار کرتے ہیں
آہ یہ شعبدے پروڈا کے
پڑ رہے ہیں وزارتی ڈاکے
صبرِ ایوب گو کھرو نے کیا
لیکن اِس فتنہ گر سے بچ نہ سکا

ے محمد ایوب کھرو مرحوم

تھے بہت سخت گیر فضل اللہ
آج کہتے ہیں یوں بحال تباہ
پہلے کچھ بھی سہی ہیں اب کیا ہوں
کشتۂ خنجر پروڈا ہوں
انتہا یہ کہ پیر زادہ سا
پیرِ دانا وہی وزیر غذا
مستعد جب یہ نا بکار ہوا!
اُس کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوا
اے خدائے جلیل و بے ہمتا
سیلِ آفات اب نہیں تھمتا
ظلم کب تک یہ بے گناہوں پر
رحم کر رحم۔ داد خواہوں پر
جو ترے فضل سے وزیر بنیں!
یوں اچانک پناہ گیر بنیں؟
تو نے بخشی ہو جن کو شانِ شہی
جن پہ تیری نگاہ لطف رہی

سے قاضی فضل اللہ۔ محمد ایوب کھوڑو۔ پیرزادہ عبدالستار مرحوم سب زمن قانون کی زد میں تھے۔

اے کریم و مُسبب الاسباب
وہ پروڈا کے ہاتھ سے ہوں خراب؟
جو پلے ہوں کرم کے چندوں پر
ظلم اُن تیرے نیک بندوں پر؟
تاجِ قیصر ہو جن سروں پہ نثار
یہ پروڈا ہے اِن سَروں پہ سوار
آرزو ہے تو بس یہی جی کی!
تجھکو یارب قسم ہے جی جی[1] کی
جو پروڈا کے زخم خوردہ ہیں!
یعنی جتنے وزیر مُردہ ہیں!
اہلِ ملّت کا دست گیر بنا
پھر انہیں قوم کا وزیر بنا
یہی ہر دم دعا ہے بار الٰہ
کہ وزارت کے نکتہ چیں ہوں تباہ
یعنی نذرِ اجل ہو یہ قانون
دور ہو یہ وزارتی طاعون
کوئی قائم مقام تک نہ رہے
اس پروڈا کا نام تک نہ رہے

---

[1] جی جی۔ یعنی گورنر جنرل۔ اُس زمانے میں غلام محمد مرحوم اس عہدۂ جلیلہ پہ فائز تھے۔

خطاب بہ پروڈا

اے پروڈا - ذرا خدا کو مان
قوم کو کر رہا ہے کیوں ہلکان
اے نتیجِ مملکت - سیاسی روگ
سہم جاتے ہیں تیرے نام سے لوگ
واقعی - قہرِ کبریا ہے تو
اے ستم پیشہ! کیا بلا ہے تو
تیری جوتی سے کس کا سر خالی
کر دیئے تو نے گھر کے گھر خالی
پست کر کے فلک نشینوں کو!
مار ڈالا تماش بینوں کو.
عطر مٹی کا جو نہ ملتے تھے
نہ کبھی دھوپ میں نکلے
تیرے ہاتھوں ذلیل و خوار ہو
خاک میں مل کے خ[illegible] ہوئے
جن وزیروں کے آستانے پر
درِ دولت پہ جلوہ[2] خانے پر

---

[1] یہ مصرعے مثنوی زہرِ عشق سے ماخوذ ہیں۔ [2] جلوہ خانہ کو برآمدہ کہہ سکتے ہیں۔

کتنے مسکین کتنے حاجت مند
جا کے ہوتے تھے روز و شب صف بند
چھوڑ کر تخت اور گنوا کر تاج
آج وہ ذی حشم ہیں خود محتاج
اُن وزیروں کا کیا کرے کوئی
کس کی حاجت روا کرے کوئی[1]
اونچے اونچے محل تھے جن جن کے
اُن سے بدلے لئے ہیں گِن گِن کے
کیسے کیسے منسٹرانِ جلیل؟
جن کا شاہوں میں تھا نہ کوئی مثیل
دیکھ کر آن بان کو تیری!
آج روتے ہیں جان کو تیری
کوئی ان کا شریکِ حال نہیں
کوئی مونس دمِ زوال نہیں
آفت اِن بیکسوں پہ آئی ہے
ناظم[2] الدین کی دہائی ہے

---

[1] مرزا غالب کا مصرع۔ [2] خواجہ ناظم الدین مرحوم۔ پہلے گورنر جنرل تھے۔ پھر وزارت عظمیٰ کے منصب پر فائز ہوئے۔

دعا بدرگاہِ الٰہی

اے کریم و رحیم و ربِّ غفور
عفو کر اِن منسٹروں کا قصور
اُن کو اعزازِ نو۔ الٰہی دے
ہے وزارت حقیر۔ شاہی دے
جَورِ اغیار و شرِّ اعدا سے
ان کو آزاد کر پروڈا سے
ان کے صدقے میں اے خدائے کریم
پھر سے عہدوں کی ہو اگر تقسیم
وہ ارسطو ہوں میں سکندر ہوں
وہ منسٹر ہوں میں سکتر[1] ہوں
اس سے زائد نہیں ہے کوئی ہوس
ہے یہی آرزو فقیر کی بس

[1] سکتر۔ سکرٹری

بھنگ نامہ

تا کجا یہ ذوقِ مے یہ کاک ٹیل
اٹھ کے ساقی! بھنگ پی اور ڈنڈ پیل
چھوڑ دے یہ ساغر و مینا کا ربط
کونڈی سونٹے سے بڑھا اب ربط ضبط
اٹھ بساطِ عالمِ بالا بچھا!
فرش مے ۔ تہ کر مرگ چھالا بچھا
مفتیانِ وقت کا ہے حکم عام
بھنگ اور افیون جائز ۔ مے حرام
دارالافتائے زمانہ کے خلاف
کون چل سکتا ہے گستاخی معاف
اے مرے نوخیز ساقی سبزہ رنگ!
گھونٹ دے خم کا گلا اور گھونٹ بھنگ
سبزۂ رخسارِ خوباں کی قسم!
بھنگ ہے سرمایۂ صد جامِ جم
اس کو چکھ کے دیکھ تو مائی ڈیر!
پانی پانی اُس کے آگے ہے بیئر
BEER

سلہ مرگ چھالا۔ ہرن کی کھال۔ جس پہ سادھو بیٹھتے ہیں۔

یہ مزا رم اور وہسکی میں کہاں؟
بھنگ پر مرتے ہیں سبزانِ جہاں
عارضِ خوباں کا سارا رنگ ڈھنگ
اِس کا رنگ اللہ و اکبر اِسکا رنگ
اِس کی مستی چشمۂ کیف و سرور
دل کی ٹھنڈک ۔ دیدۂ باطن کا نور
پھر یہ اِن اوصاف کیف بے خودی
ایک خوبی اور ہے سب سے بڑی
شیرۂ قند و نبات و شہد ہے
یہ پسندِ حاکمانِ عہد ہے
بھنگ کا کیا نشۂ شاہانہ ہے
جو بھی دفتر ہے وہ بھنگڑ خانہ ہے
ڈال سرکاری دفاتر پر نظر!
بھنگ کے آثار ہیں سب جلوہ گر
سب نظر آئیں گے متائے ہوئے
حاکم و محکوم بھنگیائے[1] ہوئے

---

[1] بھنگیانا یعنی بھنگ کے نشے میں چور چور ہو جانا۔

مے تو ہاتھ آتی ہے پیارے! بار میں
BAR
بھنگ ہے ہر کوچہ و بازار میں
آفسوں میں بھنگ سرکاروں میں بھنگ
دفتروں میں بھنگ درباروں میں بھنگ
غرق ہے سارا زمانہ بھنگ میں
پڑ گئی ہے بھنگ سب کے رنگ میں[1]
فہم و دانش کا زمانہ اب کہاں؟
قوم پر ہوتا ہے بھنگڑ کا گماں
بندشِ بادہ ۔ ۔ الٹا اثر
بھنگ پر د ۔ ۔ ری ہے ٹوٹ کر
گو کہ لیڈر جمع ہے ہر رنگ کا
ہے سیاست میں بھی عالم بھنگ کا
قوم کو کونڈی سمجھ سونٹا اٹھا
گھونٹتے ہیں بھنگ سارے رہ نما
الغرض بھنگی بنایا بھنگ نے
ہم کو مارا بھنگڑوں کے رنگ نے

[1] محاورہ ہے رنگ میں بھنگ پڑ جانا یعنی مزہ کرکرا ہو جانا۔ اِس محاورے کو الٹا کر دیا ہے۔

بھنگ پی کر ہو اگر حالت سقیم
مالوے کی گھول اے ساقی! افیم
وہ فلک پیما وہ گردوں بارگاہ
جو فقیروں کو بنا دے بادشاہ
جس کو پی کر عقلِ انساں ہو قوی
آدمی کو جو بنائے آدمی!
جس پہ اہلِ ہوش مائل آج کل
جو شرابِ ناب کا نعم البدل
جس کی عادت وجہِ بربادی نہیں
جس کا عادی مجرم عادی نہیں

سالِ نو

ساقیا! وہ سالِ نو ہے آشکار
اب نہ پچھلی حسرتوں کا کر شمار
غم[1] جو پچھلے سال میں حاصل ہوا
سب حسابِ دوستاں در دل ہوا

[1] لیاقت علی خاں مرحوم کی شہادت۔

ہے کبڈّی گاہ ۔ یہ عبرت سرا
اٹھ نئی گِلی نیا بلّا اٹھا

بندگی کا شیوہ ۔ رحمت کی طلب
درگہِ حق میں دعا ہے روز و شب

یا رب! اِس مِلّت کو تازہ جوش دے
جانِ پُر سوز و دلِ خاموش دے

قوم کو گردابِ آفت سے بچا
ہم[1] کو ناکارہ قیادت سے بچا

ہم کو اے ربّ کریم و کارساز!
بخش دے اِک قائدِ مِلّت نواز

پنجۂ آلام سے محفوظ رکھ
بھنگڑوں کے دام سے محفوظ رکھ

[1] اس زمانے میں غلام محمد مرحوم گورنر جنرل اور خواجہ ناظم الدین مرحوم وزارت عظمیٰ کے منصب پر سرفراز تھے۔

اُردو نامہ

ہے بزرگانِ قوم سے فریاد
کہ سُنیں اِس غریب کی رُوداد
کچھ بھی کہتے رہیں حسد سے عدو
نام اِس بے نوا کا ہے اردو
جدّ امجد ـ عرب نژاد مرے
باپ تھے فارسی نہاد مرے
میری ننہیال بھی بلند مقام
برج بھاشا ہے میری ماں کا نام
میرا ہم شکل ہے خطِ قرآن
عربی میری پیاری دادی جان!
فارسی میری ایک ہم جولی !
ہندی میری بہن ہے مونہہ بولی
مجھ سے سندھی کا ارتباط کہن
اور پشتو ہے خالہ زاد بہن
میں نے دہلیز سب کی ہے دابی
میری چھوٹی بوا[1] ہے پنجابی

---

[1] بوا ـ یعنی بہن ـ

کھوج پایا جو دور کی سوچی!
ہے مری رشتہ دار بلوچی
کس پہ ظاہر نہیں حسب میرا
کس سے پوشیدہ ہے نسب میرا
کیا بتاؤں ۔ کہاں رہا مسکن
سندھ و ملتان میں کٹا بچپن
ہوش کے ساتھ سن بڑھا جب اور
سیر کرنے کو میں گئی لاہور!
ہائے لاہور میں قیام مرا
آیا دلّی سے پھر پیام مرا
تُرک تازان ہند کے ہمراہ
ساتھ لے کر تمام فوج و سپاہ
راہ بے راہ ٹھوکریں کھا کر
میں نے دلّی میں دم لیا جا کر
خاکِ دہلی کا دیکھ کر جوبن!
بس اُسی کو بنا لیا مسکن!
لیکن اِس مستقل اقامت پر
میرے پاؤں میں تھا عجب چکّر

کبھی بنگال کے کئے پھیرے
کبھی ڈالے بہار میں ڈیرے
کبھی مدراس کی فضاؤں میں
کبھی آسام کی ہواؤں میں
بوئے گل تھی چمن میں جم کے رہی
ایک مدّت دکن میں جم کے رہی
تھے مرے دو وطن بہت مشہور
حیدرآباد اور بیجاپور!
لیکن اِن کوچہ گردیوں میں کبھی
چھوٹ کر بھی نہ چھٹ سکی دلّی
گھر مرا قصرِ خسروانہ تھا
آگرہ جس کا صحنِ خانہ تھا
الغرض یوں ہی گھومتے پھرتے
سالہا سال مجھ کو بیت گئے
عام لوگوں کی ترجمانی کی!
بادشاہوں کی میزبانی کی!
میں ہوں۔ صوفی سے جو گلے مل لے
خانقاہوں میں کھینچ کر چلّے!

ناگہاں جہل کا مٹا سایہ
خسروِ علم و فن کا عہد آیا
جس سے تاریخِ ہند کی تزئین
عہدِ شاہ جہاں شہاب الدین
سر پہ بالِ ہُما خدا کی قسم
تختِ طاؤس اُس کے زیرِ قدم
لال قلعہ تھا جس کا نقشِ عمل
جس کا عکسِ خیال - تاج محل
اِسی سلطانِ نکتہ پرور نے
بوالمعالی ابوالمظفر نے
خود کو شاہِ جہاں خطاب دیا
مجھ کو اردو زباں خطاب دیا
تھا جو تقدیر میں مجھے بخشا
قلعہ[1] جاگیر میں مجھے بخشا!
لیکن اِس قُربِ شاہ کے باوصف
مجھ میں گر وصف تھا تو اتنا وصف
بزمِ شہ میں اداس رہتی تھی!
عام لوگوں کے پاس رہتی تھی!

---

[1] لال قلعہ

مجھ سے جمہور کو عقیدت تھی
مجھ کو جمہور سے محبّت تھی
اُن کی روحوں کی راز داں میں تھی
اُن کے سینوں کی ترجماں میں تھی
اہلِ دولت سے بول چال تھی بند
ہم زبانی عوام کی تھی پسند
مجھ کو آدابِ انجمن سے نفور
اُمرا کے فریب و فن سے نفور
اُن کی چوکھٹ نہ چومنے والی
میلوں ٹھیلوں میں گھومنے والی
کام کی بات کام کی بولی!
سیدھی سادھی عوام کی بولی
دلّی والوں سے میں تھی شیر و شکر
جُمّا[1] مسجد سے پوچھ لو جا کر
میری طبعِ رواں کی تھی اک دھوم
گومتی[2] سے کوئی کرے معلوم
یہ روایت ہے اہلِ ذوق کو یاد
کوئی راوی سے پوچھ لے روداد

---

[1] جامع مسجد دہلی [2] گومتی۔ راوی۔ ہند و پاک کے دو دریا۔

خوب میرا نشان عظمت ہے
چار[1] مینار خود شہادت ہے
سینکڑوں محفلیں سجا کے رہی!
لکھنو میں تو گھر بنا کے رہی
موج میں آ کے دور دور گئی!
مرشد آباد[2] و رام پور گئی!
گردش بخت کا نہ تھا ہولا
پشت پر تھے جو آصف الدولہ
علم میں تھے جو شہرۂ آفاق
مجھ کو قسمت نے وہ دئے عشّاق
سرِ فہرست۔ جن کا نام جَلی!
کون وہ شاعروں کے پیر ولیؔ[3]
کیا شرف ان کی ذات پاک کو ہے
ناز جن پر دکن کی خاک کو ہے
ابتدا میں جو فن کے خاتم تھے
مظہرؔ[4] و آرزو و حاتم تھے

---

[1] حیدرآباد دکن کی مشہور عمارت [2] رام پور اور مرشد آباد۔ اردو شاعری کے دو مرکز [3] ولی دکنی
[4] مرزا مظہر جانِ جاناں۔ آرزو اور شاہ حاتم۔ اردو کے اساتذۂ قدیم۔

پھر جو اردو کے دست گیر ہوئے
اُن میں سب کے امیر۔ میؔر ہوئے
جن سے خود میں نے آبرؔو پائی
وہی سوؔدا تھے میرے سودائی
پھر ہوئے انجمن کے صدر نشیں
مصحفؔی ۔ مصحفِ سخن کے امیں
مصحفی سے رواجِ شعر ہوا!
جس کے شاہد ہیں جرأت و انشا
مجھ سے جن کو عقیدۂ راسخ
ایک آتش تھے دوسرے ناسخ
ذوقِ نو کا جو دل ہوا طالب
رونقِ انجمن ہوئے غالب
رہ گئی جب سخن میں نقالی
آئے تبدیل حال کو حالی
جن کی خدمات کی نہیں کوئی حد
شبلی آزاد اور نذیر احمد
فاتحِ فکرِ عصر سرسیّد
نظم حالی تھے نثر سرسیّد

ـه ان اشعار میں تمام شعراء اور اہل قلم کا ذکر کیا گیا ہے۔

یہ مری بزم کے تھے صدر نشیں!
جن کا ثانی کوئی جہاں میں نہیں
کیا مبارک مرا ستارا ہے
مجھ کو اقبال نے سنوارا ہے
الغرض میرا نام میرا نشاں!
مایۂ فخر ہند۔ و۔ پاکستاں
کوئی دیکھے تو میری جاں بخشی
میں نے جمہور کو زباں بخشی
جب ہوئی جاں بلب مغل شاہی
عہد اقبال جب ہوا راہی
خاتمہ کر کے خانہ جنگی کا!
دور دورہ ہوا فرنگی کا!
عربی۔ غم سے سر پٹکنے لگی!
فارسی۔ خارسی۔ کھٹکنے لگی!
طرز انگلش کا زور شور بڑھا
فاتحوں کی زباں کا زور بڑھا
چھوڑ کر رن جو سورما بھاگے
میں اکیلی تھی گو بڑھی آگے

کس نے ہمّت یہ آج تک کرلی
میں نے انگلش زباں سے ٹکرّ لی!
خود حریفانِ جنگ نے مانا
میرا لوہا فرنگ نے مانا
ہاتھ مفلوج پائے ہمّت لُنگ
قوم جب خوفِ غیر سے تھی گُنگ
سامراجی غرور و نخوت نے
سی دیا تھا لبوں کو ہیبت نے
لَبِ تنقید کھولتا ہی نہ تھا
جب کوئی ڈر سے بولتا ہی نہ تھا
میں تھی جس نے زباں کو طاقت دی
قوم کو بولنے کی ہمّت دی
دیکھ کر ظالموں کا استبداد!
میں نے چھیڑا ترانۂ آزاد!
پا کے افکارِ قوم کو گمراہ
میں نے بخشا شعور نقد و نگاہ
مرض جہل کو شفا بخشی!
میں نے تہذیب کو جلا بخشی

تجھ کو بیدار کر دیا میں نے
میں نے اے قومِ بے وفا میں نے
تیری تاریخ کی امین ہوں میں!
تیرے ماضی کی جانشین ہوں میں
قوم نے میری جیب میں پائے
عربی فارسی کے سرمائے
جس سے نکھرا ہے رنگِ آزادی!
میں نے جیتی وہ جنگِ آزادی!
اے بزرگانِ مجلس[1] دستور!
ملک میں تم ہو صاحبانِ شعور
کہیں ایسا نہ ہو کہ عجلت میں
جوشِ جذبات و فرطِ غفلت میں
قومی رفتار سست کر ڈالو
فیصلہ نادرست کر ڈالو

[1] مجلس دستور ساز پاکستان (کانسٹی ٹیوئنٹ اسمبلی) میں قومی زبان کا مسئلہ زیرِ بحث تھا۔

گرمی نامہ

جئیں خاک جینا بھی ہو گر۔میاں
قیامت ہیں اس سال کی گرمیاں
جو گرمی سے انساں کی ہے نبض سرد
تو حدّت سے خود دھوپ کا رنگ زرد
حرارت سے کرنوں کی۔ سینہ کباب
تپِ غم سے دل سوختہ آفتاب
نہیں برق و صرصر کی کچھ آبرو
بھڑکتے ہیں شعلے جو چلتی ہے لُو
فضاؤں میں طوفانِ گرد و غبار
ہوا نے یہ کب کا نکالا بخار
ہوا۔ اس پہ سو فی صدی اتحاد
کہ ہے ایک سو دس کی گرمی زیاد
جو تھے ایک سو دس[1] کے جرموں میں طاق
یہ گرمی کی ڈگری ہے ان پہ بھی شاق

---

[1] دفعہ ۱۱۰۔ تعزیرات پاکستان۔

بھلا اِس جہنّم میں کس کو سکوں
فلک بحرِ آتش زمیں موجِ خوں
زبسکہ یہ بستی ہے آفات و قہر
جرائم کی جنّت گناہوں کا شہر
سیہ کار و بدوضع وشورش پسند
گنہ گار و نادار و نا ارجمند
جو ثابت ہوا شہر بھر غنڈہ گرد
ہوا غنڈہ ایکٹ آکے گرمِ نبرد
شرافت کو گویا قضا آگئی
شریفوں پہ تازہ بلا آگئی!
یہ قانون ہے اِس قدر بے لگام
کہ ہر کام ہے اِس کی رُو سے حرام
بھلا کب کوئی عذر مسموع ہے
غمِ عشق بھی آج ممنوع ہے
غضب ہے کہیں آنا جانا حرام
کسی سے نگاہیں لڑانا حرام

محبّت میں مت خاک پھانکو کبھی!
حسینوں کی جانب نہ جھانکو کبھی!
حکومت کے غنڈے ہیں دنیا میں ہم
جہنّم کے کُنڈے ہیں عقبیٰ میں ہم
یہ قانون ہے غنڈہ گردی کا پھل
یہ موسم ہے بدکاریوں کا بدل
جو گاتے رہے جرم و عصیاں کے راگ
تو نازاں ہوئی ہم پہ دوزخ کی آگ
یہ گرمی جو اللہ کا قہر ہے
سزائے خطا کاریٔ شہر ہے
یہ موسم بھی ہے گرچہ بے قید و بند
مگر ہیں حرارت کے اسباب چند
کراچی ہے اک شہرِ آتش بجاں
ہر اک سینہ سوزاں تو ہر دل تپاں
عروس البلاد اِس کو کہیئے ہزار
"عروس البلا" ہے یہ قہری دیار

غریبوں کی بستی میں راحت کہاں
جہنّم کے سینے میں جنّت کہاں؟
جہاں غم کے شعلے بھڑکتے رہیں!
سدا نیم بسمل تڑپتے رہیں!
جہاں لب پہ شعلے ہوں فریاد کے
ہدف ہوں سبھی برقِ بیداد کے
سُلگتی ہو سینوں میں نفرت کی آگ
چھڑے ہوں جہاں فتنہ و شر کے راگ
بسے ہوں قیامت کے ہٹّی جہاں
دہکتی ہو نفرت کی بھٹّی جہاں
جہاں زیست سے سیر ہر جانِ پاک
جہاں راکھ کا ڈھیر ہر مُشتِ خاک
جہاں ذرّہ ذرّہ شرارہ خصال
جہاں ہر قدم باعثِ اشتعال
بڑھے سرد مہری تب و تاب سے
جہاں لوگ جلتے ہوں احباب سے

تبہ حال یک لخت آباد ہوں!
جہاں سوختہ بخت آباد ہوں!
جہاں اشتعال طبائع کا راج
جہاں خود حکومت ہو شعلہ مزاج
جہاں خاک پھانکیں غریب و امیر
جہاں آگ اُگلیں امیر و وزیر
کراچی کے ہر حادثے میں جہاں
سُلگتی ہوں نفرت کی چنگاریاں
جہاں گرم جوشی سے جل جائے دل
جہاں آتشِ رشک ہو مشتعل
بھلا ایسے شہر شرر خیز میں
حرارت گہِ فتنہ انگیز میں
جہاں امتحاں اِس قدر ہوں کڑے
وہاں کیوں نہ شدت کی گرمی پڑے
عذابِ جہنم جہاں ہم سہیں!
اُسے کیوں نہ دوزخ کا بادا کہیں

در بیانِ قحطِ آب

پھر ایسے بسے ہیں خدا کی پناہ
وہ پُرآب آنکھیں وہ بے آب چاہ
ذرا دیکھیئے آسمانی یہ قہر
نہ چشموں میں پانی نہ پانی میں لہر
وہاں کیا رہے خلد و کوثر کی ساکھ
جہاں تشنہ لب بیش و کم چند لاکھ[1]
عجب ہے جو آتش فشانی نہ ہو
سمندر قریب اور پانی نہ ہو
زمیں جس قدر کھودتے جایئے
فقط چشمۂ زہرِ غم پایئے
جو گہرے ہیں نکلا بھی پانی کہیں
تو کم بخت پینے کی قابل نہیں
پہاڑی سے اُبلا بھی گر آبشار
تو دوزخ کے چشمے کی جس طرح دھار
بہاتی ہے چشمِ حزیں اتنے اشک
کہ بھر جائے سقّائے کوثر کی مشک

---

[1] ۱۹۵۲ء میں کراچی کی آبادی کا تخمینہ کم و بیش یہی تھا۔

غریبوں کی کیا تلخ اوقات ہے
فقط اشکِ حسرت کی بہتات ہے
غرض ایسی گرمی میں یہ قحط آب
عذاب و عذاب و عذاب و عذاب
کہاں بھاگ جانے کا مقدور ہے
زمیں سخت ہے آسماں دور ہے

اختتام و دعا

الٰہی بحقِ سحابِ کرم
سحابِ کرم سے ہو یہ خاک نم
کراچی میں ہاتھ آئے آبِ حیات
عذابِ جہنّم سے پاؤں نجات
امیروں کو مے۔ ارغوانی ملے
الٰہی! غریبوں کو پانی ملے
مئے علم و عرفاں سے مخمور کر
الٰہی! مری تشنگی دور کر

شکارنامہ

بعدِ حمد خدا و نعتِ رسولؐ !
عرض کرتا ہے یہ ظلوم و جہول
اتفاقاً کوئی امیرِ دیار !
گھر سے نکلا برائے سیر و شکار
اللہ اللہ وہ اہتمامِ جلوس
جیسے تختِ رواں پہ کیکاؤس
عازمِ سیر ملک تھے جو حضور
دیدنی تھی سواریِ پُرنور !
ہر قدم یوں پکارتے تھے سوار
با ادب با ملاحظہ ہشیار
یوں کڑکتے تھے دمبدم کڑکیت[1]
پھینک کر بوجھ بھاگتے تھے پھکیت[2]
واہ کیا رُعب کیا تجمّل تھا
ہر طرف دُور باش کا غل تھا
فورڈ پیکارڈ کی قطاریں تھیں
کارواں میں تمام کاریں تھیں

---

[1] شاہی جلوس کے آگے آگے کڑک کر نعرے لگانے والے۔ [2] پھکیت۔ تیز۔ چالاک۔

آپ موٹی مصاحبین تھے سیپ
آ گئے آگے تھی اِک مسلّح جیپ
JEEP
جان لیوا جری جواں جانباز
جیپ میں جلوہ گر تھے برق انداز[1]
الغرض یہ جلوسِ با توقیر
جانبِ دشت یوں ہوا رہ گیر
شہر والوں کے ہوش اڑنے لگے
سب اُسی راستے پہ مُڑنے لگے
تھا جو صید افگنوں کا اِک دنگل
سارے جنگل میں ہو گیا منگل!
جی میں سرکار کے جو کچھ آئی
اس علاقے کی سیر فرمائی
دیکھتے کیا ہیں حضرت والا
وہ علاقہ ہے سب تہ و بالا
ہر قدم سو مصیبتوں کے پہاڑ
گھر ہیں سنسان اور کھیت اجاڑ
گُل شگفتہ نہ گُل کدے شاداب
کاشت ویران کاشتکار خراب

[1] برق انداز= سپاہی۔

مرحلے سنگلاخ رستے سخت
لُو کے مارے ہوئے تمام درخت
اِس طرح سارے گاؤں گوٹ تباہ
جیسے گذری ہو ڈاکوؤں کی سپاہ
یا غضب ناک ہو کے خیزا خیز[1]
حملہ آور ہو۔ لشکرِ چنگیز
نہ کسی جانثانِ خوش حالی
نہ کہیں کھیت تھے نہ ہریالی
گوشے گوشے میں کال کی آفات
قحط و طاعون سے کھنڈر دیہات
الغرض اِس جگہ بصد اکراہ
خیمہ افگن ہوا وہ عالی جاہ
دل میں صید افگنی کا جوش بھرے
ساتھ میں تھے شکاریوں کے پرے
گو کہ ہر فرد تھا سراپا گوش
مگر اِس قافلے میں اک ذی ہوش
دیکھ کر مملکت کا حال۔ تباہ
سخت آزردہ تھا وہ حق آگاہ

---

[1] خیزا خیز۔ یعنی تیز دوڑتے ہوئے!

دیکھ کر مملکت کی پامالی!
دنگ تھی اُس کی ہمّتِ عالی
قریہ قریہ تھا اِس طرح برباد
موت بھی چیختی تھی مُردہ باد
دیکھتا تھا جو ساتھیوں کی روش
دل کو ہوتی تھی اُس کے اور خلش
خون روتا تھا اُن کی غفلت پر
اشک ریزاں تھا اپنی حالت پر
منتظر تھا اک ایسے موقع کا
جب کسی جا۔ حضور ہوں تنہا
اُن کی خدمت میں عرض حال کروں
اور امداد کا سوال کروں!
لاکھ بے چارہ تلملاتا تھا!
ایسا موقع مگر نہ آتا تھا!
لوگ تفریح اور تفنّن میں
وہ فقط عرض حال کی دُھن میں
الغرض اِس طرف تھا یہ رنجور
اُس طرف مستِ جامِ عیش حضور

تھا جو مرغوبِ طبع سیر و شکار
ساتھ تھے چند حاشیہ بردار
خیمہ گاہِ طرب سے دُور چلے
شور برپا ہوا حضور چلے!
بسکہ مقبولِ آں جناب تھا یہ
خوش نصیبی سے ہم رکاب تھا یہ
خود حضور اور قافلے کے جواں
سخت گرمی میں اک طرف تھے رواں
وہ بیاباں وہ دوپہر کی دھوپ
اڑ گیا سب کا رنگ سب کا روپ
اِس تمازت سے جب ہوئے رنجور
ٹھہرے اک سایۂ شجر میں حضور
لُو میں جُھلسا ہوا اجاڑ حد کا
تھا وہ کوئی درخت برگد کا
پیڑ کی شاخ پر بہ عالمِ ہُو
بیٹھے سستا رہے تھے دو اُلّو
اُن کے انداز سے یہ تھا روشن
جیسے دونوں بہم ہوں گرمِ سخن

چھڑ گیا ہے کوئی اہم موضوع
یا کوئی داستاں ہوئی ہے شروع
بسکہ سرکار تھے بہت کم فہم
دیکھ کر اُتووں کو چیتا وہم[1]
قصّۂ دل گداز کہتے ہیں
یہ کوئی حرفِ راز کہتے ہیں
جب یہ سرکار کو خیال آیا
اہلِ خدمت سے خود یہ فرمایا
تم میں کون اسقدر ہے اہلِ شعور
کہ بنے ترجمانِ نطقِ طیور!
سُن کے مخدوم سے یہ اپنے سوال
وہی مردِ بزرگ واقفِ حال
لب کُشا اس طرح ہوا کہ حضور
بندہ ہے ہم زبانِ وحش وطیور
طائروں کی زباں سمجھتا ہے
اُن کی سب بولیاں سمجھتا ہے
سُن کے سرکار نے یہ فرمایا
تم نے آصف[2] کا مرتبہ پایا

---

[1] وہم چیتنا۔ وہم ہونا (محاورہ)۔ [2] آصف ابن برخیا۔ حضرت سلیمانؑ کے وزیر مشہور ہیں اور کہا جاتا ہے

کچھ بتاؤ یہ بوم شوم قدم
محو کس بات چیت میں ہیں بہم

حکایتِ بوم

اُس زباں داں نے تب دیا یہ جواب
اِن کا قصّہ عجیب تر ہے جناب
غم سے پیتے ہیں خون کے چُلّو
ایک کُنبے کے ہیں یہ دو اُلّو
ایک کے گھر میں دخترِ دل بند
دوسرے کا ہے نوجواں فرزند
بعض احباب نے پیام دیا
اِس کی لڑکی کو اُسکے لڑکے کا
اب یہ دونوں کہ ہیں بہم سمدھی
بات طے کر رہے ہیں شادی کی
ہے یہ لڑکے کے باپ کا اصرار
میں دلہن کے جہیز میں اے یار
لوں گا دوسو سے کم نہ ایسے گاؤں
جس میں رکھّے بلا نہ ڈر کر پاؤں

ایسے برباد ایسے غیر آباد!
دیکھ کر جن کو وحشتیں ہوں زیاد
ایسے آفت کدے سیہ خانے
جن کی ہیبت سے دنگ ویرانے
یہ تو اُسکی طلب ہے بے تاخیر
ہے یہ لڑکی کے باپ کی تقریر
کہ یہی مملکت کا حال ہے گر!
ڈُو سو کیا؟ ایسے دس ہزار کھنڈر
گر یہی ہے بحالیات کا کام!
ہوگیا مملکت کا کام تمام
گر یہی ہے مہاجرین کا حال
رونقِ سلطنت ہے اَمر محال
گر یہی ہیں ہمارے منصوبے
کل نہ ڈوبے تو آج ہم ڈوبے
قبلۂ من! مرا قصور معاف
اُلّوؤں کی یہ بات چیت ہے صاف
واقعی ہم ہیں بے وقوف کہ بوم؟
یہ حقیقت کسی کو کیا معلوم

مُسلِم لیگ نامہ

قلم! پہلے لکھ لیگ کی منقبت
اُسی کی ثنا کر اُسی کی صفت
سپہرِ حشم کا ستارہ ہے یہ
عجب قوم پرور ادارہ ہے یہ
یہ تنظیم - روح روانِ وطن
نظر کردۂ خسروانِ وطن
قیادت پسندوں کی پشت و پناہ
وزارت پرستوں کی آماج گاہ!
خواص اس سے پاتے ہیں نام ونمود
عوام اِس کی چوکھٹ پہ وقفِ سجود
زباں اس کی توصیف میں گُل فشاں
قلم اس کی تعریف میں تَر زباں
جو ہے لیگ کا بندۂ معتبر
نزول اُس پہ رحمت کا شام وسحر
جو ہے اِس کی سرکار کا خانہ زاد
خدا۔ اس سے راضی بشر اُس سے شاد

یہی مرکزِ وحی و الہام ہے!
نویدِ عمل اِس کا پیغام ہے!
سمجھتے ہیں سب اس کو اہلِ یقیں!
پیامِ وزارت کا روح الامیں
بہ فرمانِ دانش ورانِ جلیل
یہی عرشِ عظمت کی ہے جبرئیل
سجودِ وفا کا مصلّے ہے یہ
ترقی کا عرشِ معلّا ہے یہ

تخلیق لیگ

نقیبِ صداقت ہے جن کی زباں
ہے ازروئے تحقیق اُن کا بیاں
کہ جس دم مشیّت کو آیا خیال
مسلماں کو بخشے عروج و کمال
تو ازراہِ لطف و کرم اے عزیز!
کیا اس نے ناچیز کو ایک چیز
جو ذرہ کہ پستی میں تھا جاگزیں
بنا آفتابِ سپہرِ بریں!

جو قطرہ کہ ساحل پہ تھا تشنہ لب
بنایا اُسے سیلِ جہد و طلب
جو دانہ کہ تھا خاک پر پائمال
ہوئے اس کی رونق سے گلشن نہال
جو دانہ کہ تھا شاملِ گردِ راہ
بنا خسروِ عہد و میرِ سپاہ
جو شعلہ تھا افراطِ ظلمت سے ماند
تجلّی سے اس کو لگے چار چاند
بہت حیرت افزا ہے یہ ماجرا
کہ جب لیگ کا نقش پیدا ہوا
فرشتوں نے کی سر جُھکا کر یہ عرض
کہ اے وہ ثنا جس کی ہے ہم پہ فرض
یہ مخلوقِ تازہ یہ عبرت نژاد
بشر کی طرح سے نہ ہو بدنہاد
نہ بیچے کہیں قوم کی آبرو!
بہائے نہ انسانیت کا لہو!
یہ پُتلا کہ ہے آج بے چشم و گوش
نہ بن جائے عفریتِ محشر خروش

زمیں پر ازل سے ہے جنگ و فساد
نہ یہ چھیڑ دے کوئی تازہ جہاد
مسلماں ہے پہلے سے محصورِ غم
نہ پھونکے یہ ظالم کوئی صُورِ غم
یہ مُبتلا ہے فی الحال گو دھان پان
ابھی سے ہے اسکی کچھ ایسی اٹھان
کہ عہدِ جوانی میں یہ سخت گیر
ہزاروں کو غم میں کرے گا اسیر
شباب اِس کا ہوگا نویدِ بلا
عروج اِس کا ہوگا قیامت فزا
روش چھوڑ کر اپنے اسلاف کی
حکومت بنائے گا اجلاف[1] کی
قرائن یہ ہیں اے خدائے جلیل
عوام اِس کے ہاتھوں رہیں گے ذلیل
کچھ آثار ایسے ہیں اے ربّ پاک
یہ مُبتلا بنے گا بہت خوفناک
یہی اپنا معروضہ ہے صاف صاف
الٰہی! ہماری خطا ہیں معاف

---

[1] نچلے درجے کے لوگ۔

خلاصۂ کلام

غرض مرضیٔ حق سے اے لیگ دوست
بنا لیگ کے جسم کا گوشت پوست
اُتاری گئی عہدِ ماضی کی کھال
لیا۔ گوشت جسمِ وطن سے نکال
بہ مشکل یہ ساماں فراہم ہوا
بنائے گئے لیگ کے دست و پا
یہ تھا بس کہ مجموعۂ صد نظام
دیا اِس کو قومی جماعت کا نام
غرض سایۂ قوم میں رات دن
مثال مہِ نو۔ بڑھا اُس کا سِن
ہزاروں مصائب سے پالا پڑا!
مگر اُن سے یہ عزم والا۔ لڑا
ہوا۔ اک نئے عہد کا افتتاح
اتالیق اِس کے ہوئے جب جناح
پڑھیں غور سے محرمانِ حیات
یہ ہے لیگ کی داستانِ حیات

فرمانِ ربِّ جلیل

فرشتوں نے چھانٹے جو خلقت کے عیب
تو پردے سے آئی یہ آوازِ غیب
کہ اے کم شعورانِ عرشِ بریں
سنو اور سمجھو بہ علم و یقیں
یہ مخلوقِ تازہ یہ ابن عیب و شر
ہے اِک ملّتِ نو کی تصویر گر
کسی ہستیٔ عزم انگیز کا
یہ قلب ہے اک قومِ نوخیز کا
یہ نظمِ عمل کا نیا قافیہ
بدل دے گا مضمونِ جغرافیہ
روا کر کے ترمیم و تنسیخ کو!
نیا روپ بخشے گا تاریخ کو
یہ پتلا بہ بازوئے باطل شکن
اُلٹ دے گا اوراقِ عہدِ کہن
فرشتو! یہ کیوں عیب و تشکیک ہے
جو ہم جانتے ہیں وہی ٹھیک ہے

آزادی نامہ

کہاں تک شرابِ غلامی کی لت
پلا ساقیا۔ بادۂ حریت
وہ بادہ کہ ہو آبگینہ گداز!
وہ بادہ کہ ہر قید سے بے نیاز
وہ بادہ کہ اِک برقِ اندوہ سوز
سُبک۔ غم ربا۔ دل کشا۔ جاں فروز
وہ بادہ کہ مشروبِ آزادگاں
وہ بادہ کہ محبوب آزادگاں
خوشا قلزمِ گوہرِ زندگی
وہ بادہ کہ خود جوہرِ زندگی
وہ بادہ کہ صورت میں قند و نبات
وہ بادہ کہ سیرت میں آبِ حیات
سرورِ جوانی ہو اس سے دو چند
وہ بادہ کہ ہو شربت شہد و قند
کہاں تک یہ تلخ آبۂ شاخ تاک
پلا ساقیا مجھ کو صہبائے پاک

نہ افشردۂ زہرِ انگور دے
مۓ نور د پیمانۂ نور دے
وہ مے جس سے مرنے کی جاگے امنگ
وہ مے جس میں خونِ شہیداں کا رنگ
جہانِ خرد جس سے تلپٹ نہ ہو
غلامی کی جس مے میں تلچھٹ نہ ہو
وہ مے جس میں بوئے غلامی نہ ہو
وہ مے جس کی فطرت میں خامی نہ ہو

جشنِ آزادی

گراں دُختِ رز پر ہوئی قیدِ تاک!
خوشا جشنِ آزادئ ارضِ پاک
یہ شامِ سعادت یہ صبحِ سعید
یہ تقریبِ آزادگاں کی نوید!
یہ عظمت کی رات اور عظمت کے دن!
یہ آزادئ قوم و ملت کے دن
مصائب دلوں پر نہ ڈالیں کمند
نہیں اہلِ دل پر کوئی قید و بند

جو تھے زہرِ آلام سے تلخ کام
بہ قلبِ کشادہ ہیں بادہ بجام
جو تھے جورِ گردوں سے چیں بر جبیں
وہ عرشِ بریں پر ہیں مسند نشیں
گدا تھے جو کل حکمراں آج ہیں
جو محتاج تھے صاحبِ تاج ہیں
نئے ساز و آہنگ بخشے گئے!
فقیروں کو اورنگ بخشے گئے!
جو ہر بزم میں بے قرینہ سے تھے
تہی دست۔ نانِ شبینہ سے تھے
وہ تختِ شہی پر بٹھائے گئے
ولی بلکہ والی بنائے گئے
ہمیشہ تملق تھا جن کا شعار
بنے صدرِ محفل وہ دربار دار
مقدر کی اللہ رے بازی گری
کہ بازی گروں کو ملی سروری
جو درویش تھے شیخِ درگاہ ہیں
جو شطرنج میں طاق تھے شاہ ہیں

جو تھے محفلِ دہر میں کس مپُرس
وہ ہیں زندہ پیر اور کرتے ہیں عُرس
خوشا۔ عہدِ آزادی و انقلاب
وہ ابھرا نئے عہد کا آفتاب
تجدد پسندوں میں ہیں شادیاں
یہ عہدِ انقلابی یہ آزادیاں!
تغیّر کا جذبہ تحیّر فزا!
ہر اک جنس میں ہے ہر اک نوع کا
انوکھے طریقے۔ نرالے چلن
کہ زن مردِ میداں ہے اور مرد زن
جو روباہ سیرت تھے نرشیر ہیں
جو پہلے زَبر تھے وہ اب زیر ہیں
کوئی خو۔ بجز کام چوری نہیں
جوانوں میں وہ سینہ زوری نہیں
نہ بانکے نہ بانکوں میں وہ بانکپن
نہ تیور میں وہ رستمانہ پھبن!
نہ لہجہ نہ وہ بات پُرحوصلہ
ببر شیر کا جس طرح ہمہمہ

زہے یہ جوانانِ ناز آفریں!
جوانی ہے نازِ جوانی نہیں!
نہ مردانِ خانہ کا وہ اقتدار
نہ مردان خانوں کا وہ اعتبار
طبیعت نہ کیونکر مکدّر ہو سخت
بنے جنسِ نازک جو سخت و کرخت
جوانانِ ملّت کا یہ رنگ ڈھنگ
ادہر دخترِ عہدِ نو کا یہ رنگ[1]
دوپٹے کا پرچم اڑاتی ہوئی
چلی حشرِ تازہ اٹھاتی ہوئی!
قدم زن ـ بہر گامِ مردانہ ہے
ہر اقدامِ اقدامِ مردانہ ہے
اُسے کس طرح صرف عورت کہیں
یہ عورت یہ اِس عہد کی عورتیں
قوی پنجہ و چست و گردن فراز
کہ شہناز نام اور دل شاہ باز
زمانہ شناس و جہاں گرد ہیں
حقیقت ہیں یہ عورتیں مرد ہیں

---

[1] یہ وہ زمانہ تھا کہ پاکستانی معاشرے میں نئے رجحانات اُبھر رہے تھے۔

زمانہ تغیّر کا طالب ہے آج
مؤنث مذکر پہ غالب ہے آج
مگر پھر بھی یہ شہرِ عشرت اساس
فقط چار طبقوں کو آیا ہے راس
زعیمِ وطن حاکمِ پُرخروش
فقیہہ وطن تاجرِ خود فروش
زعیمِ وطن یعنی ہنگامہ باز
جو اوجِ قیادت پہ ہے سرفراز
ہر اک شاخ پر چونچ کھولے گا وہ
جہاں کوئی جلسہ ہو بولے گا وہ
کوئی لاکھ لیڈر سے ہو دل فگار
مگر سر پہ ملّت کے ہے وہ سوار
قیادت کے جادو جگاتا ہے وہ
بہر طور چندے اُگاتا ہے وہ!
بلا سے جو ٹوٹے ستم خلق پر
فدا ہے وہ آزادیِ حلق پر!
وہ کھیلے گا جذبات پُرجوش سے
کوئی جوتیاں کھائے پاپوش سے

ساقی نامہ حریّت

کمر کس کے ساقی سرِ خم نہ کھول!
کسی کوری پیالی میں افیون گھول!
امّیدوں کا ہوگا لہو بے درنگ
نہ کر اہتمامِ مئے لالہ رنگ
بہ فتوائے ملائے عالی مقام!
ہے افیون جائز۔ مگر مے حرام
شرابی ہیں اِس ملک میں دردمند
افیمی پہ کوئی نہیں قید و بند
سبب اس کا یہ ہے کہ حکامِ وقت
مزاجاً افیمی ہیں اور وہ بھی سخت
جو دفتر میں خود گھولتے ہوں مدک
شعور اُن میں کیا ہو سوائے پینک
وہ کیوں کر ہوں اہلِ وطن کے کفیل
جو دفتر میں رہتے ہوں انٹا غفیل[1]
نہ سمجھیں گے اسرارِ بادہ کبھی
حکومت میں جتنے ہیں افیون چی

---

[1] انٹا غفیل۔ سرمست و مدہوش۔

یہ رندانِ آزاد پر قید و بند
یہ شدّت پسندی یہ شدّت پسند
یہ فرقہ پرستی یہ جنگ و فساد!
یہ ہنگامہ بازی بنامِ جہاد
یہ قومی مسائل سے ان کا گریز
یہ وعظ اور تقریر طرّار و تیز
یہ گستاخیاں اور بے باکیاں!
یہ گھٹیا سیاست یہ چالاکیاں
مگر ساقیا تو نہ لب اپنے کھول!
فقط کوری پیالی میں افیون گھول
مزہ دے رہا ہے عروجِ خمار
ذرا جشنِ قومی کی دیکھیں بہار
کراچی کے عشرت پسندوں کا جشن
یہ اللہ کے نیک بندوں کا جشن
نظر مست دل مست احساس مست
یہ چودہ اگست اور یہ بندوبست
چراغاں کی شب اور خوش حالیاں
فدا جس پہ دس لاکھ دیوالیاں

بریانی نامہ

بنام خداوندِ رزق آفریں
ثنا جس کی خوراکِ جانِ حزیں
وہ رازقِ مطلق وہ روزی رساں
وہ بخشندۂ جاں وہ ربِّ جہاں
رگِ جاں سے ہے گو کہ نزدیک تر
مگر بھوکے معدے میں ہے جلوہ گر
کرم خاص تھا عام کی نعمتیں
یہ انواع و اقسام کی نعمتیں!
غذا ۔ کس کو حق سے میسّر نہیں
زمیں ۔ خوانِ نعمت سے کم تر نہیں
ہر اِک شے کو خوراکِ مطلوب دی
جو شے جس کو بھی حق نے دی خوب دی
ستاروں سے پُر بطنِ افلاک ہے
معادن کا گھر معدۂ خاک ہے
وہ پیرِ فلک ہو کہ زالِ زمیں[1]
سبھی خوانِ نعمت کے ہیں ریزہ چیں

---

[1] زالِ زمیں ۔ زمین کی بڑھیا۔

زمیں کو ملی سنگ ریزوں کی دال
فلک کو دیا صبح کا شیر مال
سجایا ہے یوں خوانِ ایام کو
شفق کا ملا شوربہ شام کو
فلک جلوہ گاہ مہ و آفتاب
حقیقت میں اک کوفتوں کی ہے قاب
نہ کیوں قرصِ[1] خورشید کا ہو ظہور
کہ گردون گرداں ہے یکسر تنور
نہ کہیئے کہ مذبح ہے مسلخ[2] ہے یہ
دو عالم کے داتا کا مطبخ ہے یہ
یہ دنیا ہے انعام ربِّ جہاں
ہر اک قسم کی نعمتیں ہیں یہاں
شکم کی غذا فضلۂ تہ نشیں
قلم کی غذا حمدِ رزق آفریں
الٰہی! بحق شکم پروراں!
عطا کر مجھے معدۂ ہفت خواں
جو معدہ عدوئے غذائے لطیف
جو معدہ کہ بریانیوں کا حریف

---

[1] قرص خورشید (سورج کی ٹکیا) [2] مسلخ کھالوں کا گودام۔

وہ معدہ کہ لقموں کا طالب رہے
وہ معدہ جو ہیضے پہ غالب رہے
وہ معدہ کہ تخمہ[1] رہے جس سے دور
وہ معدہ کہ آرام گاہِ طیور!
جو معدہ گرانی میں سیروں کا ہو
جو گنج شہیداں بٹیروں کا ہو
وہ معدہ جسے کوفتوں سے ہو کد
وہ معدہ کہ ہو مرغیوں کی لحد
وہ معدہ کہ ہو معدنِ خشک و تر
برنج اور گندم کا گودام گھر
جہاں ڈھیر کی ڈھیر بریانیاں
جہاں قورمے کی ہوں نہریں رواں
بحقّ امیرانِ معدہ پرست
کسی ایسے معدے کا ہو بندوبست
نہ خاطر میں لائے کبھی صوم کو
نگل لے جو اِک قوم کی قوم کو
وزیروں کا مہماں بنوں ہر سحر
ہر اک شام ہو میری شام ڈنر

---

[1] تخمہ۔ ہیضہ

غرض یہ دعا ہے مری روز و شب
کہ اے میرے رزاق اے میرے رب
نہیں ہے مجھے احتیاجِ دماغ
بس اک معدۂ باعمل با فراغ
وہ معدہ کہ ہو ہاضم ضبط و نظم
وزارت کے عہدوں کو کر لے جو ہضم
نہ کر ساقیا! اہتمام شراب
کھلا سیخ کے اپنے ہاتھوں کباب
خوشا روزِ مسعودِ عید الضحیٰ!
کہ اک جشن ہے از سمک[1] تا سما
ہر اک سو ذبیحے کا ہے اہتمام
ضیافت کے ہیں منتظر خاص و عام
نہ کر مرغ و ماہی پہ ساقی نظر
کہ جانِ ضیافت ہے لحمِ بقر[2]
کہیں دنبہ و بز کی قربانیاں!
کہیں گائے کی ذبح سازنیاں
بطِ مے کی باتیں نہ للہ چھیڑ
بنام خدا ذبح کر کوئی بھیڑ

---

[1] سمک وہ روایتی مچھلی جس پر زمین قائم ہے۔ [2] گائے کا گوشت۔

مئے لالہ گوں کی ہوس ہے زبوں
مئے لالہ گوں ہے ذبیحے کا خوں
میسّر ہو جو دال دلیہ کھلا
بطِ مے[1] کا فی الحال قلیہ کھلا
یہ پینا پلانا ہے امرِ حرام
[illegible] قرباں ہے یوم الطعام
دوا خاطرِ مضمحل کی نہیں!
ضیافت ہے معدے کی دل کی نہیں
خوشا عیدِ قرباں کا روزِ سعید
ہے تمہید اس عید کی حج کی عید
یہ ہے گوسفندوں کا یومِ وصال
وہ ہے حق کے بندوں کا روزِ کمال
ذبیحے سے ہے عیدِ قرباں کی شان
تو حج اہلِ ایماں کا اک امتحان
وہاں ذبحِ دنبہ پہ ہے اکتفا
یہاں قتلِ نفس اوّلیں مرحلہ
وہ گوشت اور کھالوں کی تقریب ہے
یہ اللہ والوں کی تقریب ہے!

---

[1] وہ بوتل جس کی شکل بط کی طرح ہوتی ہے۔

چہرہ نامہ

سرافرازی کے باندھے سر پہ سہرے
نظر آتے ہیں رنگا رنگ چہرے
یہ چہرے رُوکشِ آئینہ رُویاں
نمائش گاہِ نازِ مشک بُویاں!
یہ چہرے۔ چہرۂ نظمِ جلالت
یہ چہرے جلوۂ عزم و بسالت
یہ چہرے فردِ خد و خال جن کے
جبینوں سے عیاں اعمال جن کے
یہ چہرے جن کے خد و خال ممتاز
یہ چہرے فتنہ پرور شعبدہ باز!
ہمارے رہ نماؤں کے یہ چہرے
وطن کے ناخداؤں کے یہ چہرے
لکھا ہے جن پہ قدرت کے قلم نے
بنایا ہے انہیں کیا چیز ہم نے
یہ چہرہ دور سے دیکھو تو گُل رنگ
قریب آؤ تو یکسر چہرۂ سنگ

نہ اس میں رحم و رافتؔ کی جھلک ہے
نہ اخلاص و محبّت کی چمک ہے
نہ کوئی نرمی و اخلاص کا نور
یہ چہرہ دیو چہرہ چشم بد دور
سراسر کاغذی پھولوں کا گلشن
تصنّع کا ہے اِس پر رنگ و روغن!
یہ جب محفل میں ہوتا ہے نمایاں
تو اِس پر قوم ہوجاتی ہے قرباں!
یہ چہرہ چہرہ فتنہ گری ہے
بناوٹ اسکی نس نس میں بھری ہے
یہ چہرہ دفترِ اسرار دینی!
علامت اسکی ہے سرکہ جبینی[2]!
یہ چہرہ مصدرِ کشف و کرامات
یہ چہرہ جس پہ صدقے اہلِ حاجات
نیا شیوہ انوکھا طور بھی ہے
اِسی چہرے کا اک رُخ اور بھی ہے
وہ رخ جو چہرہ محشر دکھائے
خدا۔ اِس رُخ سے ملّت کو بچائے

---

[1] رافت نرمی [2] سرکہ جبینی ۔ خفگی ناراضی

نمونہ قدرتِ اللہ کا ہے!
یہ چہرہ۔ حاکمِ ذیجاہ کا ہے!
کوئی اِس سے اگر آنکھیں لڑائے
یہ برہم ہو کے فوراً مونہہ چڑائے
یہ کیوں درج ہو اس چہرے کا حُلیا
حکومت کا بگاڑا اِس نے حُلیہ
یہ چہرہ اِس طرح کرسی نشیں ہے
کہ ہر رخ قوم کا زیرِ نگیں ہے
سنو اے کم نصیبو کم عُدوجو
بُتِ اکبر سمجھ کر اِس کو پوجو!
مصائب کے نشاں ہیں جن پہ دُہرے
غریبوں کے وہی ہیں چہرے مُہرے
نزولِ ذلّت و ادبار اِن پر
یہ چہرے ہیں خدا کی مار اِن پر
یہ فاقے کے نشانوں سے سجے ہیں
کہ جب بھی دیکھیئے بارہ بجے ہیں
غرض باندھے نشاط و غم کے سہرے
کراچی کے یہ رنگا رنگ چہرے

دستور نامہ

پلا ساقیا! بادۂ دل نواز!
کہ ہے جلسۂ بزم آئین ساز
وطن کے بزرگان صاحب نظر
ہوئے مجلسِ بحث میں جلوہ گر
کہ مل جُل کے دستور سازی کریں
بصد جوش ہنگامہ بازی کریں
اُٹھ اے ساقیٔ حشر انگیز، اُٹھ
ہے رفتارِ عالم بہت تیز اُٹھ
زمانے کی رفتار کا ساتھ دے
نہ بن اجنبی ہاتھ میں ہاتھ دے
نہ کوثر نہ انگور کی مے پلا
نئے طرز و دستور کی مے پلا
نئی مے نئے قاعدے سے انڈیل
شرابِ کہن کو سقر میں دھکیل
ہوئی بزمِ رنداں کی تزئین نو
مبارک ہو صہبائے آئین نو

نہ کر آج تو کل کے وعدے وعید
کہ ساقی یہ دن ہے نہایت سعید
یہ دن کیوں نہ ہو عہدِ نو کا نقیب
کہ دستور سازی کے ہیں دن قریب
یہ دن کیوں نہ ہو تازگی کا پیام
بدلنے کو ہے سارا کہنہ نظام
یہ دن کیوں نہ ہو باعثِ امتیاز
بناتے ہیں دستور ۔ دستور ساز
ترقی کے نکتے جو مانے گئے
وہ بدحالیوں کے زمانے گئے
نئے عزم سے ساقیؔ باعمل
پرانے قوانینؔ تو بھی بدل !
ابھی تک وہی کہنہ آئین ہے
ترا مے کدہ تیری توہین ہے!
نہ کر شیوۂ تازہ سے انحراف
یہ صورت ہے آئینِ نو کے خلاف
یقیں جلوہ گر جائے تشکیک ہے،
کہ تشکیلِ دستور نزدیک ہے

ہر اِک قلب میں ولولے ہیں یہی
ترے ذہن میں ہیں وہی وسوسے
تجھے ساقیا آج بھی ہے یہ شک
کہ جھوٹے نگینے کی ہے سب چمک
ترے دل میں ہے آج بھی اضطراب
کہ یہ چشمۂ شہد ہے اک سراب
منڈھے چڑھ سکے گی نہ ہرگز یہ بیل
کہ دستورِ تازہ ہے جادو کا کھیل
مگر اے مرے ساقیٔ باشعور
یہ اوہام ہیں حق پسندی سے دور
بنامِ خدا ۔ خالقِ بے نیاز
پلا جھک کے صہبائے دستور ساز
فروغ و تجلی کی صہبائے نور!
وہ پاکیزگی کی شرابِ طہور
بڑھے جس سے قانون کی آبرو
منظم ہو جس مے سے یہ بزم ہُو
نہ بدنظمیاں حسبِ دستور کر!
نیا عہد ہے کسبِ دستور کر

وہ دستور جس سے وطن کا وقار
قوانینِ پارینہ جس پر نثار
خرد مطمئن آگہی جس سے شاد
خدا جس سے راضی نبیؐ جس سے شاد
ترقی پسند و سعادت نصیب
وہ تنظیم و جمہوریت کا نقیب
وہ مغرب کی سرمایہ داری کا توڑ
وہ آئین کی حکمتوں کا نچوڑ
وہ محبوبِ ہر عالم و مجتہد
وہ تحریکِ فرقہ پرستی کی ضد
وہ عدل و ترقی کا سچا نظام
مدارِ عمل ہے وہی والسلام

میلادنامہ

پلا ساقیا مے بہ عزمِ جواں
کہ ہے جشنِ میلادِ پیرِ مغاں
دسمبر کی پچیس - تابندہ عید
ظہورِ مسیحا کا روزِ سعید
بروئے تواریخ و فنِ حساب
یہ ہے جشنِ پیدائشِ آفتاب
مناتے تھے جس کو بہ نام و نمود
مسیحی - مجوسی - یہودی - سود
رسوم و عمل میں تھا گو اختلاف
مگر اس کی عظمت نمایاں تھی صاف
یہ دن جس پہ اقوام کو ناز تھا
نئی زندگی کا سر آغاز تھا
خزاں کی یخ آلود راتوں کے بعد
یہ دورِ بہاراں تھا مسعود و سعد
نئے عہد کا بانی و کردگار
نئی رُت کا ہوتا تھا اس سے شمار

بڑائی سے اِس کی بپاس ادب
بڑے دن کا بخشا تھا اسکو لقب
تغیّر زمانے میں آئے ہزار
مگر اُس کی عظمت رہی برقرار
یہ ہے مرکزِ زندگی آج بھی!
بڑائی ہے اِس کی وہی آج بھی!
کروں شرحِ اوصاف و حالات کیا؟
کہوں چھوٹے موہنہ سے بڑی بات کیا
عجب اِس کی شانِ کرامات ہے
بڑے دن کی ساقی بڑی بات ہے
ذرا۔ اِسکی معجز نمائی بھی دیکھ
بڑے دن کی ساقی بڑائی بھی دیکھ
مسیحا کے جشنِ ولادت کا دن
یہ میلادِ بابائے ملّت کا دن
مبارک کلیسائیوں کے لئے!
کرسمس یہ عیسائیوں کے لئے
ہمارے لئے بھی یہ روزِ سعید
سعادت فزا صورتِ روزِ عید

ہوا۔ آج اُس رہ نما کا ظہور!
دیا جس نے ملّت کو تازہ شعور
جری۔ کامراں۔ باعمل بے ہراس
رکھی جس نے اِک مملکت کی اساس
کیا تنگ اغیار کا قافیہ
بدل کر تواریخ و جغرافیہ
جو ملّت تھی صدیوں سے زار و زبوں
جو خاکِ مذلّت پہ تھی سرنگوں
وہ زنجیرِ آہن میں جکڑی ہوئی
غلامی کے بندھن میں جکڑی ہوئی
یہ ثمرہ غلامی کا تھا ناگزیر
سمجھتی تھی اپنے کو خود بھی حقیر
ہنود اور برٹش کے اہلِ نظر
سمجھتے تھے ہم کو فقط جانور
چراغ آدمیّت کا ہوتا تھا گُل
اِدھر گائے ماتا اُدھر جان بُل[1]
نہ روحانیت تھی نہ انسانیت
فقط کارفرما تھی حیوانیت

---

[1] وحشی سانڈ۔ برٹش سامراج کا نشان۔

یہ ماحول تھا اِس قدر دل شکن
کہ قومی ترقّی تھی بے حد کٹھن!
یہ قانونِ قدرت ہے اے نکتہ داں
کہ ظلمت سے ہو صُبحِ تازہ عیاں!
غرض تیرگی جب کہ تھی بے قیاس
مسلماں تھا محصورِ خوف و ہراس
ہوا اَمرِ حق سے بصد حُسن و نور
بڑے دن بڑے آدمی کا ظہور
وہ سرمایۂ فتح و فوز و فلاح
محمد علی نام ۔ نامی جناح
وہ قائد۔ وہ صورت گرِ ارض پاک
وہ سیلِ عزیمت مگر مُشتِ خاک
تہی دست ملّت کا وہ دست گیر
بباطن جوانمرد ۔ ظاہر میں پیر
سُبک رو بہ اندازِ محشر روی
بدن ناتواں ۔ اور ہمّت قوی

کراچی نامہ

کراچی کی لکھنی ہے رُودادِ غم[1]!
مسلسل بہا اشکِ خوں اے قلم
یہ روداد ہے اس قدر دردناک
کہ ہے خامۂ دو زباں سینہ چاک
یہ رُوداد کتنی الم کوش ہے
ہر اک سطر۔ غم سے سیہ پوش ہے
حروف اور الفاظ ماتم کناں
تو نقطوں پہ داغِ جگر کا گماں
بیاضِ سخن ہو نہ کیوں کر سیہ
کہ تحریر کرنا ہے اک مرثیہ
یہ ذکرِ مصائب یہ قیدِ رقم
مری طرح سر پیٹ لے اے قلم
لہو آج اے چشمِ داوات رُو
رُلاتے ہیں ملّت کے حالات رو
یہ تلقینِ صبر اور قلبِ حزیں
نہیں صبر کا کوئی موقع نہیں

---

[1] ۸، ۹، جنوری کو کراچی میں حکومت وطلبہ کے درمیان خونیں تصادم ہوا تھا۔

جو فرد آج بھی مست و سرشار ہے
وہ کم بخت ملت کا غدّار ہے
جو رفتارِ دوراں نہیں دیکھتا
وہ اندھا ہے اندھے کو سوجھے گا کیا؟
جسے آہ پر بھی ہو نغمے کا وہم
وہ بہرا ہے بے بہرۂ عقل و فہم
غلط فہمیوں کی روش چھوڑ دو
اُٹھو خود فریبی کے بُت توڑ دو
ہمیں بھی یہ دن دیکھنا تھا صد آہ
کراچی میں بلوہ خدا کی پناہ
جہنم بنے شہرِ مینو سواد
عروس البلا ہو عروس البلاد
جہاں ہم نے پایا ہو امن وسکوں!
وہ خاک اور اک تودۂ خاک وخوں
ہماری امیدوں کا رنگیں محل!
ہمارے عزائم کا دارالعمل
بتا اے مری آرزوؤں کے شہر
بھلا کس لئے تجھ پہ ٹوٹا یہ قہر

کہاں آگ بھڑکی کدھر لگ گئی
تجھے آہ کس کی نظر لگ گئی
حوادث تجھے آہ کیا کر گئے
ترے زندہ دل سب کہاں مر گئے
جواب اس کا دے اے عروس البلاد
ذرا سے تصادم سے اتنا فساد
زمانے کی گردش سے ہو کر تباہ
تجھے ہم نے سمجھا تھا جائے پناہ
بزرگوں کی قبروں سے موںہہ موڑ کر
ہزاروں برس کے وطن چھوڑ کر
سہی۔ بزم میں بن بلائے تھے ہم
مگر کن امیدوں سے آئے تھے ہم
ہمارا یہی فیصلہ تھا اٹل!
کراچی ہے دلّی کا نعم البدل
مگر اے دیارِ عزیز و جمیل
ہوئے اپنے ہاتھوں یہاں ہم ذلیل
یہ کس کو پتہ تھا یہ کس کو خبر؟
کہ ہے تاک میں دیوِ تخریب و شر

جہاں امن و عشرت ہوں ہم جولیاں!
چلیں گی دُنا دَن وہاں گولیاں
جہاں گو نجتے ہوں مسرّت کے راگ
وہاں پھیل جائے گی دم بھر میں آگ
برستی ہوں دن رات خوشیاں جہاں
گریں گی سر راہ لاشیں وہاں
جہاں زیست ہے رقصِ سرشار میں
وہاں موت ناچے گی بازار میں
یہ عبرت کی جا ہے غضب کا مقام
کراچی کی سڑکوں پہ بلوائے عام
نہ تابِ سخن ہے نہ تابِ قلم
سلام اے قلم الوداع اے قلم

○

سوئی گیس نامہ

گانجا نہ چرس مَدک نہ افیون
بدلی ہے خمار نے نئی جُون

دامانِ زمین سے چھن کے آیا
ظالم سوئی گیس بن کے آیا

گانجے کی چلم ہے گلخنِ[1] غم
ساقی ! سوئی گیس کا لگے دم

کیوں اِس پہ کریں نہ رندِ عَش عش
ہے دافِعِ کشمکش یہی کَش

رندوں کو ہو کیوں مَدک کا چسکا
موقع نہیں آج کل چرس کا

ہے چارۂ زہرِ غم سوئی گیس
حقّے ہیں پیئیں گے ہم سوئی گیس

سُلفے کے قریں نہ جائیں گے ہم
اِس گیس کے دم لگائیں گے ہم

افسردہ ہے مے کشوں کا عملہ
بھر کر سوئی گیس سے چلم لا

---

[1] گلخن بھاڑ کو کہتے ہیں۔ جس میں چنے بھونے جاتے ہیں۔ ان اشعار میں حقہ نوشی کی اصطلاحات بیان کی گئی ہیں۔ مثلاً دم لگانا۔ کش لگانا۔ سلفہ وغیرہ۔

جو قدرتی اسلحوں سے ہے لیس
ساقی! سوئی گیس ہے سوئی گیس
یہ سوز و دخان و شعلۂ خام
فطرت کا ہے اک عجیب انعام
شعلہ ہے فروغ جاں اِسی کا
ہے برقِ عمل دھواں اِسی کا
اک روحِ لطیفِ دُود و آتش!
فطرت کی ہے اک عجب نوازش
شعلوں کی یہ نظم نامقفّیٰ!
یہ آگ کا جوہرِ مصفّا
ظاہر میں جواں مگر کہن سال
اک دودِ رواں و برقِ سیّال
انساں کی نگاہ سے نہفتہ
صدیوں سے تھا زیرِ خاک خفتہ
قرنوں کا خمارِ سر سے بھاگا
یہ خواب سے زیرِ خاک جاگا
کس لیلیٰ ارض کا ہے یہ قیس
اللہ رے شعلۂ سوئی گیس

یہ صنعتی بھٹیوں کا ایندھن
یہ قدرتی طاقتوں کا مخزن
ہر چند کہ پھل ہے کوئلے کا
کیا خوب بدل ہے کوئلے کا
بجلی کو ہے اس سے سرگرانی
پیٹرول ہے اس سے پانی پانی
یہ ملک ہے دولتِ خداداد
یہ مال ہے نعمتِ خداداد
اس گیس سے فائدہ اٹھا کر
اے کشورِ پاک! شکر ادا کر
ہے باعثِ لطف و نیک سوئی گیس
اللہ کی دین ہے سوئی گیس

○

صنعت نامہ

دنیا مے و مغ کا کارخانہ
ساقی! مے صنعتِ مخانہ
وہ پیرِ مغاں کی دستکاری
وہ موجد مستی و خماری
کیوں گردِ الم سے جی ہو میلا
جو صانعِ کیف ہو وہ مے لا
مصنوعِ بشر نہ ہو جو خالی
جس مے کی ہوں صنعتیں نرالی
جس مے میں ہو اختراع و ابداع!
وہ مے کہ ہو جذبوں کی صنّاع
کامل ہو جو مے۔ بکارِ مستی
یعنی وہ خرابِ کارِ مستی!
مستی کا وہ مست کارخانہ!
کام آتی ہے جو بہ کارِ خانہ[1]
عقدوں کی کشا کشیں ہوں جس میں
صد رنگ نمائشیں ہوں جس میں

---

[1] کارِ خانہ۔ گھریلو کام

ابداع کی مے ہے بدعتی ہے
اِس عہد کی مے بھی صنعتی ہے
ساقی ! مےَ آگہی سے ہوں چور
کیوں صنعتِ کارِ گاہ انگور !
سائینس سے اِنس و جن ہیں حیراں
سائینس کی مے سُرورِ عرفاں
جس مے میں خرَد پرستیاں ہیں
سائنِ لُطف اُس کی مستیاں ہیں
ساقی نہ پلا خروش کی مے
حکمت کی شرابِ ہوش کی مے
کب تک سنوں وقت کی زبانی
مصنوعی نمائشی کہانی !
اٹھ صانع جہد و ارتقا ہو !
صنعت کی ثنا میں لب کُشا ہو
سائینس ہے آج کی حقیقت
یہ عہد ہے عہد فن و صنعت
باطل ہوئے شعر کے صنائع
ہیں اور صنائع و بدائع !

حکمت کا ہوا جنون ۔ تازہ
ایجاد ہوئے فنون ۔ تازہ
دنیا نہیں کُھنگی یہ راضی!
ماضی کا ہے علم ۔ علمِ ماضی
ہر حلقۂ وہم سے ہے آزاد
اِس عہد کی فکرِ تازہ ایجاد
اللہ رے آدمی کی عظمت
محکوم ہے آدمی سے فطرت
فطرت کی جو طاقتیں تھیں آزاد
ہنگامۂ ابر و موجۂ باد
ہر اِک یہ ہے جِن ہیں قدرتی چھاپ
وہ کُہربا وہ دخان وہ بھاپ
پہنائیٔ بحر و رفعتِ کوہ!
چھایا ہوا جنگلوں کا اَنبوہ!
یہ بحر یہ برّیہ غرب یہ شرق
ظلماتِ سحاب و جلوۂ برق
کجلائے ہوئے وسیع صحرا
بل کھاتے ہوئے طویل دریا

آکاش پہ وہ دھنک وہ سج دھج
سیّارے ستارے چاند سورج
خوشے پودے درخت دانے
فطرت کے یہ بے بہا خزانے
قدرت نے ہیں جن کے روپ چھانٹے
وہ شاخ و شجر وہ پھول کانٹے
حاقت کے دبے ہوئے خزینے
ایٹم کے چھپے ہوئے دفینے
قطروں کی وہ وسعتیں جہاندار
ذرّوں کی وہ طاقتیں پُراسرار
القصہ یہ کائناتِ عالم
ہے آج اسیر دامِ آدم
فطرت کی تمام قوتوں کو
قدرت کی تمام دولتوں کو
انسان نے کھود کر نکالا!
سائنٹفک صنعتوں میں ڈھالا
ہو کوئی بھی چیز خوب و ناخوب
سائنس کے سامنے ہے مغلوب

انقلابِ وزارت

اے قلم! لکھ بیان درد فزا
انقلابِ وزارتِ عظمےٰ!

دم کے دم میں یہ کیا ہوا نیرنگ
مملکت کا بدل گیا سب ڈھنگ

اُف یہ دورِ جہاں یہ گردشِ بخت
اب نہ وہ تخت ہے نہ صاحبِ تخت

منقلب[۱] یہ جہانِ فانی ہے
جز خدا ۔ کون جاودانی ہے

ناظم الدین[۲] کیبنٹ کا نشان!
اب کہاں؟ کُل مَن علیہا فان

اونچے اونچے مکان تھے جن کے
آج وہ تنگ گور میں ہیں پڑے

کل جہاں پر شگوفہ و گل تھے
آج دیکھا تو خار بالکل تھے

جس جگہ کل تھا بلبلوں کا ہجوم
آج اُس جا ہے آشیانۂ بوم

۱؎ ماخوذ از مثنوی سرِ عشق۔ ۲؎ گورنر جنرل غلام محمد نے خواجہ ناظم الدین مرحوم کی وزارت کو برطرف کر دیا تھا اور محمد علی بوگرہ وزیراعظم مقرر ہو گئے تھے۔

عطر مٹّی کا جو نہ ملتے تھے
نہ کبھی دھوپ میں نکلتے تھے
اُن کے سب ولولے ہلاک ہوئے
کاخ والے الٹ کے خاک ہوئے
کل جو تھے صاحبانِ طبل و علم
آج وہ سرنگوں ہیں یا بے دم
جن کو بخشا تھا حق نے رتبۂ تاج
سر چھُپانے کو آج ہیں محتاج
خانۂ عیش ہو خراب ایسا؟
انقلاب اور انقلاب ایسا؟
کل جو افراد تھے بلند اقبال
آج عبرت فزا ہے اُن کا زوال
جن سے کل مملکت کی زینت تھی
جن پہ خود مفتخر وزارت تھی
شان تا مصر و روم تھی جن کی
ساری دنیا میں دھوم تھی جن کی
وردیاں جن کے تن پہ سجتی تھیں
نوبتیں جن کے در پہ بجتی تھیں

لہ یہ اشعار مثنوی زہر عشق سے ماخوذ یا مقتبس ہیں۔

نام ور جن سے سلطنت کا نشان
جن کا سکّہ تھا مملکت میں رواں
آج وہ صاحبانِ عظمت و جاہ
ڈھونڈتے پھر رہے ہیں جائے پناہ
حسرتیں جن کی بے کسی پہ نثار
بن گئے اپنی عظمتوں کا مزار
کیا قیامت تھی سترہ[1] اپریل
جب کہ امڈا تھا انقلاب کا سَیل
ہے یہ تاریخ قابلِ تنسیخ !
کہ زوالِ وطن کی ہے تاریخ
جب کبھی اِس دن کی یاد آئے گی
روح پر بجلیاں گرائے گی

[1] ۔ ۔ اپریل کو مفلوج اور مجہول گورنر جنرل ملک غلام محمد نے یکایک خواجہ ناظم الدین مرحوم کی وزارت کو برطرف کر کے چودھری محمد علی بوگرا کو ۔ جو امریکہ میں پاکستان کے سفیر تھے ۔ وزارت سازی کی دعوت دی تھی ۔ اس واقعے سے پاکستان کے سیاسی زوال کا آغاز ہوا۔

نئے وزیرِ اعظم کے نام

فتح و اقبال کے مبارک پیک[1]
اے محمد علی! سلام علیک
بارگاہِ وزیرِ نامی میں!
آپ کی خدمتِ گرامی میں
نذرِ اخلاص لے کے آیا ہوں
تحفۂ خاص لے کے آیا ہوں
چند پیغام ہیں عقیدت کے
کچھ کرن پھول ہیں نصیحت کے
پیار کا رس محبتوں کی مٹھاس
میرے پھولوں میں ہے یہی بو باس
پہلے میری طرف ہو ایک نگاہ!
میں بہ ایں لے کسی و حالِ تباہ
جو ہر اک سر میں ہے وہ سودا ہوں
عہدِ حاضر کا میر و سودا ہوں
دھوم ہے میرے شعر و انشا کی
نکتہ سنجی ہے مجھ پہ انشآ[2] کی

---

[1] پیک۔ قاصد۔ خبر رساں [2] انشاء اللہ خاں انشا مرحوم

سُن کے چرچے مری لیاقت کے
مجھ پہ الطاف تھے لیاقت کے
گو نہ مُلّا ۔ نہ کوئی پیر تھا میں
ناظم الدّین کا مشیر تھا میں
اے وزیرِ فہیم و ہند پسند
عرض خدمت ہیں یہ نصائح چند
یہ حکومت ہے ایک عکس رواں
آج ظالم یہاں ہے کل ہے وہاں
ایک معشوقۂ تلوّن کوش!
ایک محبوبۂ ہزار آغوش
حقِ الفت ادا نہیں کرتی!
یہ کسی سے وفا نہیں کرتی
قیصر و جم سکندر و دارا
اِس نے کس کس کو پیار سے مارا
دوسرے کو رکھے گی خاک عزیز
کل لیاقت کے در کی تھی یہ کنیز
جن سے یہ دوستی جتاتی ہے
اُن کو آخر ہوا بتاتی ہے

لہ ہوا بتانا ۔ بے وقوف بنانا ۔

خون سے عاشقوں کے پلتی ہے
یہ بلا جان لے کے ٹلتی ہے
تجربے گو ہزار کرتے ہیں!
پھر بھی لوگ اِس بلا پہ مرتے ہیں
قہر ہے اُس کے عشق کی رُوداد!
سنیئے مجھ سے یہ شعر یا استاد
عشق سے کون ہے بشر خالی[1]!
کردیئے جس نے گھر کے گھر خالی!
مار ڈالا تماش بینوں کو!
زہر کھلوا دیا حسینوں کو
ظاہراً صاف باطناً گندہ
بس یہی ہے نصیحتِ بندہ
خاک بھائے گی دل کو ذنی چیز
یہ حکومت ہے آنی جانی چیز
پھر یہ میوہ نجانے ہو کس کا
آپ رس تک نچوڑ لیں اِس کا
عیش کوشی کے میوہ چینی کے
ہیں یہی دن تماش بینی کے

---

[1] یہ دونوں شعر مثنوی زہر عشق سے ماخوذ ہیں۔

گر نہ ہو خاطرِ شریف پہ بار
بس یہی ہے مری نصیحت یار
دل میں اُبلا جو درد کا لاوا
آپ نے کردیا عجب دعویٰ
گفت راوی ہمہ بہ گردن اوست
آپ ہیں ہم مہاجرین کے دوست
کوئی دنیا کا غم نہ دین کا غم
کیوں یہ آخر مہاجرین کا غم
محترم! آپ کو ہوا کیا ہے
ایسی باتوں سے فائدہ کیا ہے؟
بیٹھ کر مسندِ وزارت پر
آپ روئیں ہماری حالت پر؟
دادِ حسرت نہ دیجئے للّٰلہ
ایسی باتیں نہ کیجئے للّٰلہ
عملاً کچھ نہ کیجئے تدبیر
سخت مبہم ہے عقدۂ کشمیر
بسکہ نازک مزاج ہے اس کا
نعرہ بازی علاج ہے اس کا

اتفاق اِس پہ تھا قیادت کا
ناظم الدّین کا لیاقت کا
متفق جس پہ تھے یہ دونوں حکیم
کیا وہ نسخہ ہے قابلِ ترمیم؟
ہے جہاں تک تعلّقِ دستور!
عرض اِس خاکسار کی ہے حضور
ملک ہے ابتدا سے بے آئین
آپ کیوں اِس کی کیجئے توہین
خوگرِ قید و بند ہے یہ قوم!
بادشاہت پسند ہے یہ قوم!
یہی بہتر ہے وضعِ دستوری
چھوڑیئے یہ نظامِ جمہوری
شکل یہ انقلاب کی ہوجائے
تاج پوشی جناب کی ہوجائے

مثنوی جشنِ عید

قلم پہلے کر حمدِ خالق رقم
کہ پیدا کیے جس نے لوح و قلم
قلم کو جو تھی نکتہ سنجی کی دُھن
تو پہلے لکھا لوحِ قدرت پہ "کُن"
ہوئے کُن سے ارض و سما آشکار
ہے دو حرف سے دو جہاں کی بہار
کوئی کُن کے اسرار سمجھا کہاں
فقط کُن سے ہے کُنہ[1] کون و مکاں

نعت رسولؐ

قلم! گلشنِ نعت کے پھول چُن
کہ ذاتِ محمدؐ ہے تفسیر کُن!
نہ کیوں نام اس کا ہو تسکینِ خلق
وہ ہے حدّ امکانِ تکوینِ خلق!
ریاض مشیّت کا شاداب گُل
زہے خواجۂ خواجگان رسُل

---

[1] کُنہ یعنی بنیاد۔

زہے مہبطِ وحئ روح الامین!
وہ اسریٰ کی محفل کا مسند نشین!
محمدؐ پہ آفاق میں صبح وشام
ہزاروں درود اور لاکھوں سلام

درمدح والئ عہد

ثنا اُس کی فرض نیاز اے قلم
جو ہے والئ ملک وطبل و علم
فرو زندۂ مسندِ سروری
فرا زندۂ پرچم قیصری!
وہ مسعود طالع وہ فیروز بخت
خداوندِ تاج و خداوند تخت!
خدا۔ اُس کو دائم سلامت رکھے
سلامت رکھے باکرامت رکھے
اگرچہ نوازش ہے اُس کی مدام
یہاں روز و شب عشرت صبح و شام
ہر اک لمحہ مسعود و سعد وسعید
ہر اک شب۔شبِ قدر۔ ہر روز عید

مگر اللہ اللہ روزوں کی عید
یہ طاعت کے مجلس فروزوں کی عید
یہ دیندار یہ حق پسندوں کی عید
یہ اللہ کے نیک بندوں کی عید
یہ عید اُن کی ہے جن کا ماہِ صیام
یہ عید اُن کی ہے جن پہ لاکھوں سلام
رضائے خدا سے جنہیں کام ہے
یہ عید اُن کے روزوں کا انعام ہے
ذرا غور سے دیکھ اے نکتہ داں
کراچی کی عیدِ طرب کا سماں
عجب شان و شوکت سے آباد ہے
یہ اِس عہد زرّیں کا بغداد ہے
یہ اربابِ ہجرت کی جائے پناہ
مسلماں و اسلام کی جلوہ گاہ
یہ ارضِ مبارک یہ شہرِ سعید
ہزاروں مسلماں ہیں جس کے مرید
اِسی کشور حق میں اے ارجمند!
اس عہد زرّیں میں اے دردمند!

بہت کم ہیں ایسے سعادت نصیب
جنہیں عید پر ہو مسرّت نصیب
یہ بدحالی و سخت جانی کی عید
گرانی کی اور سرگرانی کی عید
نظر آئیں گے ہر طرف اہلِ یاس
دریدہ لباس و پریدہ حواس
یہ عبرت فزا ہے تماشائے عید
کسی کو نہیں آج پروائے عید
میسّر کسی کو یہاں کیا نہیں
کوئی عید کا نام لیوا نہیں
بڑی شئے ہے عشرت پرستوں کی عید
مگر ہم سے کچھ فاقہ مستوں کی عید؟
نہ مٹھّی میں زر ہے نہ قابو میں جی
نہ اِلّی للذی ہیں نہ اُلّل للذی
نہ کیوں عید کے دن ہوں جینے سے تنگ
نہ انٹی[1] میں نامہ نہ دل میں اُمنگ
بھلا ختمِ روزہ سے امّید کیا
کہ روزے ہی غائب رہے عید کیا؟

---

[1] اک طرح کی جیب۔

الیکشن نامہ

الیکشن زدہ ہیں ترے تشنہ لب
پلا ساقیا - بادۂ منتخب
وہ مے جس پہ لیڈر کا جی لوٹ پوٹ
وہ مے ووٹروں میں لقب جس کا ووٹ
وہ مے جس کو محراب و منبر سے عار
وہ مے جس میں ہے ممبری کا خمار
نہ وہسکی عطا کر نہ ساقی بیئر
وہ مے جس کا نشہ بنا دے میئر
سیاست کی دنیا میں مانی ہوئی
وزارت کے دامن میں چھانی ہوئی
پیا لے پلا - ساقیٔ دل نواز
مۓ ممبری - لیگ کی خانہ ساز
یوں ہی چھلک کے پی اور چھلک کر پلا
کہ ہے کارپوریشن اِس کا صلہ
جو شانِ صدارت کا ٹھاٹ اِس میں ہے
وزارت کی پُرکیف چاٹ اِس میں ہے

جو مے تازگی بخش کر جان کو
منسٹر بناتی ہے انسان کو
نہ عہدے نہ اب لیڈری چاہیئے
مجھے تو فقط ممبری چاہیئے
وہ مے جس میں ہو عشرت باقیہ
وہی ساقیا - ساقیا - ساقیا
جسے پی کے مستی ہیں تیری قسم
کروں داستانِ الیکشن رقم
ہوا - گرم ہنگامہ انتخاب
لکھوں ایک شہ نامہ انتخاب

ترتیب میدان جنگ

یہ جنگِ الیکشن کا دلکش سماں
دکھا اے قلم اپنی جولانیاں
بہت دن سے تھا یہ کراچی کا حال
کہ تھے پہلوانانِ ملت نڈھال
کوئی اِن میں رستم کوئی سام[1] تھا
مگر جو بھی تھا سخت ناکام تھا

[1] ایرانی دیومالا کا خیالی پہلوان

الیکشن سے پبلک کو آتی تھی شرم
سیاست کا دنگل نہ ہوتا تھا گرم
مگر دم کے دم میں یہ کیا ہوگیا
سیاست کا جنگل ہرا ہوگیا
جدھر دیکھیے۔ جس طرف دیکھیے
نئے سورما صف بہ صف دیکھیے
ذرا دیکھیے اِس لڑائی کا ڈھنگ
قیامت ہے ترتیبِ میدانِ جنگ
صفیں اپنی باندھے بصد عز وجاہ
ہے دنگل میں اک سمت یکّی سپاہ
دعائیں کہ اے پاک پروردگار
تجھے فضل[۱] کرتے نہیں لگتی بار
یہ نعرے لبوں پر بجوشِ وغا
کریما بہ[۱] بخشائے بر حال ما
یہ دعوے کہ ہم ہیں پرانے بھگیت
مجاہد جری ڈنڈے باز اور لٹھیت[۲]
وہ ہم جس نے دی ہے فرنگی کو مات
وہ ہم جس کی برٹش نے مانی ہے بات

---

[۱] یہ مصرعے زبان زد خاص دعام ہیں [۲] لٹھیت۔ لٹھ چلانے والے۔

ہیں اِس لشکرِ لیگ میں وہ جرّی
جو رستم سے کرتے ہیں زور آوری
نہیں اُن کی جرأت کا کوئی جواب
سب اسفندیار اور افراسیاب
لیے اپنے ہاتھوں میں گرزِ طلا
عزائم کو دیتے ہیں اپنے جلا
نشانی ظفر یاب ہونے کی ہے
سپر اُن کے ہاتھوں میں سونے کی ہے
بھلا کس میں جرأت کہ سر بر رہے
سنہری روپہلی ہیں سب اسلحے
مقابل ہے اِن کے جو فوج قلیل
خود اپنی ہزیمت کی زندہ دلیل
نہ عزم و ارادہ نہ شان و شکوہ
نہ افسر ہے ان میں نہ کوئی گروہ
دھڑکتے ہیں دل بولتا ہے جو زن
صدا گونجتی ہے بگیر و بزن
نہ بڑھ جائے حد سے الیکشن کا بیر
الیکشن کا انجام یا رب بخیر

وہ ہم ہیں سے اِس قوم کی آن بان
وہ ہم جس نے دشمن کے کلٹے ہیں کان
ہمارے مشیرِ صلاح و فلاح!
محمد علی المخاطب جناحؒ!
ہے پونجی ہماری قیادت کی لیگ
وہی لیگ بابائے ملت کی لیگ
ہمیں حق نے بخشا ہے تاجِ حشم
لیاقت علیؒ خاں کے سر کی قسم
ہمیں ہم ہیں دشمن کی آنکھوں میں خاک
ہماری وراثت ہے یہ ارضِ پاک
نئے عہد کے والی و حکم راں
ہمیں ہیں جہاں گیر و شاہ جہاں
میسّر جسے عظمت و اوج ہے
غضب کی یہ فوجِ ظفر موج ہے
یہ اِس کھیت کے بیج سر سبز ہیں
فضا سرخ - پرچم مگر سبز ہیں

تاج پوشی

ساقی ! اِدہر آ - بہ گرمِ جوشی
یہ جشنِ عظیم تاجِ پوشی
ہے تختِ شہی پہ جلوہ افگن
سلطانۂ شہریارِ لندن
وہ خلق پر کبریا کا سایہ
ہم جس کی ہیں مستقل رعایا
صدیوں سے وفا شعار اُس کے
پشتوں سے وظیفہ خوار اُس کے
طاعت کے پڑے ہوئے ہیں چسکے
محکوم ہیں ڈیڑھ سو برس کے
اک عمر کی بندگی پہ مغرور
ہر چند کہ قول ہے یہ مشہور
رسم است کہ کاتبانِ تحریر
آزاد کنند بندۂ پیر
گو بندۂ پیر ہو گئے ہم
کچھ اور اسیر ہو گئے ہم

لـه یہ مثنوی دولت مشترکہ کی سربراہ ملکہ الزبتھ کی تاجپوشی کی تقریب پر کہی گئی تھی -

ہم دولتِ مشترک کے افراد
کہنے کے لئے ہزار آزاد!
ایوانِ حشم سجا سجا کر!
بیٹھے ہیں حکومتیں بنا کر
گو ہم کو نصیب موبنہ زبانی
آزادی و مطلق العنانی
سلطان و سفیر و میر ہم میں
ہر گام پر اک وزیر ہم میں
چھوٹے بڑے شہر یار کتنے
بندوں میں ہیں تاجدار کتنے
ہر شہر میں والیٔ ولایت
ہر صوبے میں مجلس وزارت
لیکن بخدا یہ کارخانہ!
یا کوئی فسوں ہے یا فسانہ؟
یہ دولتِ مشترک ہے وہ دام
ہیں جس کی اسیر چند اقوام
بے بہرہ و بامراد ہیں سب
سرکار کے خانہ زاد ہیں سب

وہ جس کے حضور سب نگوں سر
وکٹوریہ جاہ - الزبتھ[1] فر
خاتونِ حریمِ بادشاہت
اڈورڈ[2] کی وارثِ حکومت
وہ حاکمِ وقت بے تحکّم
وہ چشم و چراغِ جارج پنجم
ہے حکم اُسی کا کارفرما
بھارت کی زمین ہو کہ برما
وہ سایۂ لطف زیرِ افلاک
سایے ہیں اُسی کے کشورِ پاک
اللہ ری اُس کی شان عالی
افرنگ کی وہ ولیؔ و والی!
وہ نقطۂ خاص ہر عمل کا
وہ دولت مشترک کی ملکہ
بیگانۂ حکم ہے بظاہر
قبضے میں اُسی کے حکم آخر

---

[1] الزبتھ اول کے زمانے میں انگریزوں نے برِ کوچک کا رخ کیا تھا۔ [2] ملکہ وکٹوریہ [3] ایڈورڈ ہشتم ۔ جارج پنجم۔ جارج ششم اور پھر ملکہ الزبتھ۔

کام اپنا ہے اور راج اس کا
نام اپنا ہے تخت و تاج اس کا
ساقی۔ بکمالِ عیش کوشی!
ہے آج اُسی کی تاج پوشی
لندن کا سماں ہے کیا نرالا؟
ہر ملک کا سر اٹھانے والا!
مائل بہ قعود اُس کے در پر
ہے سر بہ سجود اُس کے در پر
سب پر ہے خمارِ عجز چھایا
افریقہ۔ کناڈا اور ملایا
خود کشورِ پاک کے سپاہی
ہیں حاضر آستانِ شاہی[1]
از بسکہ یہ جشن ہے دل افروز
پہرے پہ ہیں مستعد شب و روز
بھارت کے بھی سورما گرانڈیل
اس فرض کی کر رہے ہیں تکمیل

---

[1] ملکہ الزبتھ کے جشن تاجپوشی میں شرکت کے لئے پاکستانی فوج کا ایک دستہ بھی سلامی دینے لندن گیا تھا۔

المختصر۔ اذنِ شاہ پاکر!
سب دولتِ مشترک کے چاکر
طے کرکے فراق کے کڑے کوس
لندن میں ہوئے ہیں آستاں بوس
ساقی! نہ پلا روایتی مے
بندے کو چکھا ولایتی مے
وہ مے کہ ہے سرد و گرم دیدہ
وہ مے کہ فرنگ کی کشیدہ
پی لے جو اُسے گدائے گم راہ
بن جائے وہ شاہ بلکہ جم جاہ
وہ شہد کو سم بنانے والی
درویش کو جم بنانے والی
زندہ ہے اُسی سے نظمِ مُردہ
امپیریل ازم کا فشردہ
انگریز کی کرکے کاسہ لیسی!
انگلش سے چھکا، پلا نہ دیسی
ساقی! ادھر آ۔ گرم جوشی
یہ جشنِ عظیم تاج پوشی

نہرو نامہ

مے کدے میں ہے برہمن[1] کا عمل
ساقیا! لا پوتّر گنگا جل:
دیوتاؤں نے جس کو چکھا ہے
ہر غلاظت سے پاک رکھّا ہے
اس میں ہے رنگ رنگ کیف و سرور
صرف انگارہ ہے مئے انگور
سر بہ سر آبِ زندگانی ہے
اور یوں دیکھنے میں پانی ہے
گنگا مائی کی گود کا پالا!
ایک دنیا کو پالنے والا
اپسراؤں[2] کے من میں اِس کی ہوس
بڑھ کے امرت سے ہے یہ جیون رس
جب یہ گنگوتری[3] سے چلتا ہے
کوہساروں کا دل دہلتا ہے
ہردوار ایک مرحلہ اِس کا
ہر کی[4] پیڑی ہے مے کدہ اس کا

---

[1] جواہر لال نہرو کے دورۂ پاکستان کے موقع پر۔ [2] اپسرا۔ حور [3] گنگوتری۔ گنگا کا سرچشمہ۔

کر کے جنگل پہاڑ کو بس میں
موج اڑاتا ہے یہ بنارس میں
اپنے لب پر لئے پریم کے راگ
اس کی تفریح گاہ ہے پریاگ[1]
نہ کپٹ[2] کا نہ پاپ کا سنگم
گنگا جمنا ملاپ کا سنگم
کیا امنگوں کے پھول کھلتے ہیں
دونوں دریا یہیں تو ملتے ہیں
تشنگی سے ہیں تنگ ہم ساقی
تجھ کو پریاگ کی قسم ساقی
نہیں پڑتی برہ[3] کی آگ سے کل[4]
جل رہا ہوں۔ عطا ہو گنگا جل
کس قدر پاک کس قدر شفاف
نرم۔ نرمل۔ پوتر سادہ صاف
خم میں اس طرح سے چھلکتا ہے
آئنہ جس طرح جھلکتا ہے
کیوں نہ ہو ہم سے پاپیوں کو حلال
اُس کا ساقی ہے خود جواہر لال

---

[1] پریاگ۔ الٰہ آباد [2] کپٹ۔ کینہ۔ [3] برہ۔ فراق [4] کل۔ پڑنا۔ بے چین رہنا۔

کیا ہو تعریف اس کی۔ کیا ہوتی
وہ جواہر وہ لال وہ موتی!
دُر۔ یک دانۂ عروج و کمال
گوہرِ قلزمِ جمال و جلال
اِس میں موقع نہیں کوئی شک کا
کان کا کچّا بات کا پکّا!
گو طبیعت قلندرانہ ہے!
پھر بھی شیوہ مدبّرانہ ہے
گو ہر اک بات میں ہے الھڑ پن
کہ ابھی جیٹھ ہے ابھی ساون
ابھی غصے میں آگ بن جائے
ابھی برکھا کا راگ بن جائے
پھر بھی اُس کے جو ہیں مزاج شناس
دل میں لاتے نہیں ذرا وسواس
جانتے ہیں کہ پاک باطن ہے
گو بظاہر فساد ۔ ممکن ہے!
جب وہ غصّے میں روٹھ جاتا ہے
اُس کے غصّے پہ پیار آتا ہے

آج بھارت کا یہ عظیم سپوت
جو ہے خود اپنی عظمتوں کا ثبوت
اک بریمی کا خود بدل کر بھیس
لے کے آیا ہے پیار کا سندیس
تحفۂ خاص پیش کرتے ہیں
نذرِ اخلاص پیش کرتے ہیں
اے عظیم و جلیل راہ نما!
تیری آمد۔ مصالحت افزا
دیر میں صورتِ حرم تجھ سے
آج بھارت کا ہے بھرم تجھ سے
ہم بھی مِن حیثِ ملتِ آزاد
ہیں ترے دوست اے جگت آزاد
ہو مبارک برائے اہلِ جہاں
کوثر و گنگ[1] کا یہ ربطِ نہاں
تا بجھے یہ نزاعِ دیرینہ!
جب کہ دونوں کا صاف ہے سینہ
طے نزاعی معاملہ کر لیں
دوستی کا معاہدہ کر لیں

[1] گنگا

گوسفند نامہ

عیدِ قرباں کی حکایت فرض ہے
ایک بکرے کی کہانی عرض ہے

نام اُس بکرے کا تھا صحرا نورد
اہلِ دل اہلِ محبّت اہلِ درد

نیک انسانوں سے بڑھکر حق پسند
مردِ مومن تھا وہ مخلص گوسفند

گوسفندوں میں کہاں انساں کا مکر
قدر کیا بکرے کی جانیں زید و بکر

گو نہ ملتا اُس کو خدمت کا صلہ
گلّہ بانوں کا نہ کرتا تھا گِلہ

اپنی پیاری سرزمیں پر لوٹ پٹ
نام تھا اُس کے وطن کا پاک گوٹ

پاک گوٹ اک مختصر دیہات ہے
گاؤں کہہ دینا گنوارو بات ہے

خود عجوبہ اور آبادی عجیب
مختصر بستی - کراچی کے قریب

تھا اِسی بستی کا ساکن یہ جواں
ہاریوں کا ہم نصیب و ہم عناں
اپنے کوہ و دشت میں صحرانورد
گرمِ عشرت تھا سدا باقلبِ سرد
تھا گزارہ گو خس و خاشاک پر
ناز تھا اُس کو وطن کی خاک پر
لیکن اِس حُبِ وطن کے باوجود
تھا یہ بجرا طالبِ نام و نمود
ذکر جب سُنتا کراچی کا وہ بُز
شوق سے کرتا یہ دل میں پُخت و پُز
مسکنِ کہنہ سے ہجرت ہو نصیب
اور کراچی کی زیارت ہو نصیب
شاہدِ نو کا محافہ دیکھ لوں
منظرِ دارالخلافہ دیکھ لوں
تھا اِسی جذبے سے وہ آتش بجاں
رات دن ہجرِ کراچی میں تپاں
تھا ہمیشہ سے یہ اُس کا اعتقاد
ہے کراچی خطّۂ رہینو سواد!

یہ چمن ہے غیرتِ باغِ جناں
ہر طرف ہیں شہد کی نہریں رواں
ہیں وہاں کے رہنے والے سب کے سب
حق کے پیارے بندگانِ خاصِ رب
فتح و فیروزی کی منزل ہے یہ شہر
ارضِ پاکستان کا دل ہے یہ شہر
آہ اک بکرے کے یہ افکارِ زشت
تھا کراچی اُس کے خوابوں کی بہشت
جب کبھی آتا شہر سے کوئی وہاں
دیر تک سنتا یہ اُس کی داستاں
ایسی باتوں سے مزہ پاتا تھا وہ
جی ہی جی میں اپنے دہراتا تھا وہ
دہر سے مطلب نہ اہلِ دہر سے
عشق تھا اُس کو کراچی شہر سے
عشق آخر برسرِ کار آگیا
کوئی بکروں کا خریدار آگیا
جب پڑی بکرے کے کانوں میں بھنک
آگیا وہ روزِ ہجرت یک بہ یک

الغرض بکروں کا گاہک بہرِ عید
گاؤں کے چونچال بکروں کو خرید
دشت کی دولت کما کر ہاتھوں ہاتھ
شہر کی جانب چلا ریوڑ کے ساتھ
تھا انہی بکروں میں یہ صحرانورد
اپنے گلّے کے عقب میں مثلِ گرد
شوق کا منظر تھا جیتا جاگتا
ناچتا۔ گاتا اُچھلتا بھاگتا
اپنے لہجے میں صدا دیتا ہوا
دل سے گاہک کو دعا دیتا ہوا
شاد کام و شاد شاد و شادماں
تھا کراچی کی طرف بکرا رواں
الغرض طے کر کے سارا مرحلہ
شہر کے نزدیک پہونچا قافلہ
دور سے عالم عجب آیا نظر
شہر کیا ہے؟ وادیٔ شمس و قمر
اِس چراغاں سے تو ہوش اُس کے گمے[1]
روشنی کے قمقمے ہی قمقمے!

---

[1] گمے یعنی گم ہوئے۔

نور و نکہت کا ذخیرہ ہو کوئی!
جیسے پریوں کا جزیرہ ہو کوئی
دنگ اِس منظر سے تھا صحرانورد
گرمیٔ الفت سے بھر کر آہِ سرد
یوں لگا کہنے کہ اے رشکِ ارم
میں ترا فدیہ ہوں قربانت شوم
شہر میں داخل ہوا جب قافلہ
چاکی[1] واڑہ تھا وہ پہلا مرحلہ
رفع کرنے گلّہ بانی کی تکان
اِس جگہ دم بھر کو ٹھہرا گلّہ بان
ہوگیا صحرانورد سادہ دل
دفعتاً منزل پہ آ کے مضمحل
دیکھتا کیا ہے کہ اُس کے چارسو
گندگی کے ڈھیر ہیں یا گندہ بُو
آدمی جتنے بھی آتے ہیں نظر
آدمی سب لے شک ہیں لیکن جانور
رُخ پہ زردی۔ خشک لب تیور کڑے
سب کے دل پر بوجھ تن پر چیتھڑے

---

[1] چاکی واڑہ۔ ایک مضافاتی علاقہ۔

زیست کی چوکھٹ سے دُھتکارے ہوئے
غربت و افلاس کے مارے ہوئے
مکر کی باریکیاں چاروں طرف!
جہل کی تاریکیاں چاروں طرف
ناتوانی وہ کہ بالکل دھان پان!
مضمحل چہروں پہ فاقوں کے نشان
اکثریت کا یہی احوال تھا
اک گروہِ مختصر خوشحال تھا
نیک بجرے نے جو دیکھا یہ سماں
ہوگیا آنکھوں سے اپنی بدگماں
جس کو بچپن سے یہ اپنے ہو یقیں
ہے کراچی غیرتِ خلدِ بریں!
جو سمجھتا ہو اُسے عشرت کا گھر
عدل کا گہوارہ اور حکمت کا گھر
جس کا یہ ایقان ہو یہ اعتماد
اُف کراچی۔ اے کراچی زندہ باد
امن و آزادی کا گھر سمجھے اِسے
جو دیارِ معتبر سمجھے اِسے

جو کراچی کو سمجھتا ہو بہشت
کیا کہے وہ دیکھ کر یہ حالِ زشت
تھا بہت گو مبتلائے رنج و درد
اپنے اِس احوال سے صحرا نورد
پھر بھی کہتا تھا یہ دل میں بار بار
ہے یہ منظر۔ سر بہ سر بے اعتبار
اس سے آگے بڑھ کے پاؤں گا وہ شہر
جس کو کہئے جانِ مشرق شانِ دہر
بکرا پیڑی سے چلا جب قافلہ
سب کے دل میں جاگ اٹھّا ولولہ
یونہی طے کرتے ہوئے اپنا سفر
آئے کھارادر سے بندر روڈ پر
اپنے گلّے میں مثالِ خضرِ راہ
سب سے آگے تھا وہ سب کا خیر خواہ
جب کہ بندر روڈ پہونچا کارواں
زندگی آئی نظر جلوہ کناں
وہ عماراتِ جلیل و سربلند
وہ مکاناتِ جمیل و دل پسند

ــہ گردوں کی مثل۔

وہ دوکانیں مال و دولت سے بھری
دُودھیا سی چاندنی پھیلی ہوئی
نازنینوں کے حسینوں کے پرے
ہر قدم پر مہ جبینوں کے پرے
لیکن اِس جشنِ طرب کے ساتھ ساتھ
بھیک کو پھیلے ہوئے تھے کتنے ہاتھ
ایک لقمے کے لئے کتنے بشر
ہوٹلوں کے سامنے دَریوزہ گر
کتنے بچے ایک پیسے کے لئے
موٹروں کے ساتھ پیہم بھاگتے
دیکھ کر یہ منظرِ عبرت فزا
زندگی سے ہوگیا بکرا خفا
آج تک اُس نے جو دیکھا خواب تھا
سب فریب خنجر قصّاب تھا
کیوں نہ بیچارے کو آتی جھرجھری
چھپ گئی ہر شکل جب چمکی چھُری
زندہ باد اے فدیۂ راہ وفا!
تجھ پہ اے مرحوم بکرے فاتحہ

سال نامہ

دنیائے کہن ہے در پئے نو
ساقی! مہِ نو ہے لائے نو
اِس عالمِ تیز رَو کا تحفہ
وہ مے کہ ہے سالِ نو کا تحفہ
وہ بادۂ نو کہ تازگی بخش
جو وقت کی طرح زندگی بخش
ہر چند کہ مے کا جوہرِ ناب
ہو جاتا ہے کہنگی سے پُر تاب
کہتے ہیں یہ مے کشانِ سادہ
خوشتر ہے جو کہنہ تر ہو بادہ
لیکن یہ جہانِ جدّت آئیں
ہے کُہنہ مزاج و ندرت آئیں
بھاتی نہیں کوئی شے پرانی
ہو جامِ کہن کہ مے پرانی
ہے تازگی زندگی کا غازہ
ساقی! مجھے دے شرابِ تازہ

لُو اِک قدم بڑھ گیا زمانہ
چھیڑو نئے سال کا ترانہ
بیکار ہے کل کا ذکر۔ ساقی
ہے آج کی فکر۔ فکر۔ ساقی
کھوئے ہوئے مال کا صلہ کیا
گذرے ہوئے سال کا گِلہ کیا
اِس سال کے معرکے غضب تھے
اِس سال کے حادثے عجب تھے
یہ سال نہ تھا اُمنگ کا سال
آفات کا عہد۔ جنگ کا سال
اے دوست! فلک کی چشم ترسے
کیا حادثے اِس برس نہ برسے
یہ سال شگفتگی سے خالی
یہ سال۔ تمام خشک سالی
اجناس کا قحط تھا نرالا
اِس کال سے مونہہ ہوا ہے کالا
فردوس میں تھا سقر کا عالم
گیہوں کو ترس رہے تھے آدم

دیوالیہ منڈیوں کے تجّار
رونق پہ تھا کچھ تو بھور بازار
عسرت نے طلب کا زور توڑا
بازار میں گاہکوں کا توڑا
ہلکان تھے جسم و جان دونوں
ویران تھے جسم و جان دونوں
آلام کی قلب میں درآمد
جانوں کی تھی جسم سے برآمد
دشواریاں امتحاں و تکلیف
ہر سمت تھی دفتروں میں تخفیف
گاتا تھا مزے سے قہر کے گیت
تخفیف کا ہولناک عفریت
القصہ وہ سال ـ سن تریپن[۵۳]!
خوشحالی قوم کا تھا دشمن
ہنگامہ و اضطراب دیکھا
اک اور بھی انقلاب دیکھا[1]

[1] گورنر جنرل مرحوم غلام محمد نے بیک جنبش ابرو۔ ناظم الدین مرحوم کی وزارت کو برطرف کر دیا تھا۔

یوں دم میں بدل گئی وزارت
جیسے دلِ مضطرب کی حالت
جس طرح ہدف پہ تیر بیٹھے
مسند پہ نئے وزیر بیٹھے
اللہ رے عہد انقلابات
دیکھا تو بدل چکے ہیں حالات
ہر چند کہ دَور تھا اچانک
یہ دور تھا ناگزیر بے شک
تاریخ کا لازمی عمل تھا
یہ حادثہ واقعی اٹل تھا
کب زخم جگر چھپا سکیں گے؟
اِس سال کو ہم بھلا سکیں گے؟
صہبائے امید پیے یہ پیے دے
ساقی! مجھے سالِ نو کی مے دے
کیوں پچھلے برس کی نوحہ خوانی
آفاق پہ آگئی جوانی!
دعوٰے ہے یہ وقت تیز رَو کا
پھر دور ہو جامِ نو بہ نو کا

گذارشِ احوال

ہو ضرورت جو عرضِ حق کی شدید
پھر ضروری نہیں کوئی تمہید

کب ہے محتاج خوبئ گفتار
مدعائے ضروری الاظہار

مولوی فضل[1] حق ابوالقاسم
عرض کرتا ہے بندہ آثم

آج سرکار ہیں بصد اقبال
شیرِ بنگال و قائدِ بنگال

رہ نماؤں کے رہ نما ہیں حضور
پیشواؤں کے پیشوا ہیں حضور

آپ ہیں۔ جا نہیں تامّل کی
قبلہ گاہِ سیاستِ ملکی!

آپ ہیں باوجود سوءِ ظنی
مدّعئ قیادتِ وطنی!

بن کے مخدومِ محفلِ ملّی
آپ نے جائے صدرِ محفل لی

---

[1] مولوی ابوالقاسم فضل حق نے جو اس وقت مشرقی پاکستان کے وزیراعلیٰ تھے۔ کلکتہ جا کر پاکستان کے بارے میں غلط اور گمراہ کن بیانات داغ دیے تھے۔

آپ کی حرکتیں عفاک اللہ!
آپ کی خدمتیں جزاک اللہ!
یہ بیاسی برس کی عمرِ شریف
یہ بیاسی برس کی فکر کثیف
دست گیرِ محاذِ متحدہ[1]
اے وزیرِ محاذ متحدہ
کیا کرشمے یہ لیڈری کے نہیں
آپ سب کے ہیں اور کسی کے نہیں
دنگ سب آپ کے جلال سے ہیں
آج سے کیا پچاس سال سے ہیں
کیسے پولیٹکل فسانہ طراز
آپ ہیں قائدِ قیادت باز
ہیں مسلّم یہ آپ کے اوصاف
لیکن اے محترم۔ قصور معاف
ہو ضرورت جو عرض حق کی شدید
پھر مناسب نہیں کوئی تمہید
آپ کو باہمہ نزاکت احوال!
حق نے بخشی وزارت بنگال

[1] مشرقی پاکستان میں متحدہ محاذ (جگتو فرنٹ) کی وزارت برسر اقتدار تھی۔

لے کے دس بارہ سال کا بن باس
بن گئے قائدِ عوام النّاس
باوجودیکہ آپ کا کردار!
باوجودیکہ آپ کے اطوار
سخت مبہم خطا معاف رہے
راہ اخلاص کے خلاف رہے
آپ نے ہم سے لاکھ مونہہ موڑا
پھر بھی ہم نے نہ آپ کو چھوڑا
لیگ سے یوں خفا خفا سے رہے
آپ مل کر مہا سبھا سے رہے
لیکن اِس انحراف کے باوصف
اور اِس اختلاف کے باوصف
بدنصیبی تھی اہلِ ملّت کی
آپ کوشہ ملی وزارت کی[1]
بن گئے زینۂ عروج و کمال
انتخاباتِ مشرقی بنگال!
خود پرستوں کے دست گیر بنے
آپ بنگال کے وزیر بنے

---

[1] مرحوم فضل حق نے آل انڈیا مسلم لیگ سے بغاوت کر کے ہندو مہا سبھا سے اتحاد کر لیا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد

جب نصیب اہل خانہ کا پھوٹا!
چھینکا بلّی کے بھاگ سے ٹوٹا
آج جب انقلابِ حالت سے
بلکہ حالات کی عنایت سے
ہاتھ آیا ہے رتبۂ والا
مل گئی ہے وزارتِ اعلا
عرض یہ ہے وزیر اعلا سے
اور کس سے؟ جناب والا سے
تھا نہ اس عہد میں مناسبِ حال
آپ کا قصدِ مغربی بنگال
پھر وہاں آپ کی گل افشانی!
ہائے دانا یہ تیری نادانی
چڑھ گئے آپ غیر کے ہتھے
پہونچے ڈھاکے سے جب کہ کلکتے
دشمنوں کے شریکِ راز رہے!
خوب غیروں سے ساز باز رہے
پا کے غیروں کی بزم میں درجے
لیگ پر آپ بلے ٹکے گرجے

لیگ وہ باوقار مسلم لیگ
قوم کا اعتبار مسلم لیگ
خوبی و خدمت و فلاح کی لیگ
قائدِ اعظمِ جناح کی لیگ
بہرہ مند حصولِ پاکستان!
نقش بند اصولِ پاکستان
خون مانگا جو اُس کی عظمت نے
جان دے دی شہیدِ ملّت نے
خوب بزم عدو میں کُھل کھیلے!
بوس[1] بابو کے بن گئے چیلے
آپ کا جب خیال کرتا ہوں
آپ سے اک سوال کرتا ہوں
کتنے پیچیدہ و ادق ہیں آپ
فضلِ حق ہیں کہ قہرِ حق ہیں آپ

---

[1] ممتاز ہندو رہنما۔

کھٹمل نامہ

میں کہ ہوں بیشۂ وغا کا پلنگ[1]
رات تھا کھٹملوں سے دست بہ جنگ
وار لیتے نہ تھے وہ بد اطوار
لڑ رہے تھے نئی گُریلا وار!
کبھی تکیے کی اُوٹ مورچہ بند
کبھی بستر پہ کھا رہے تھے زقند
چادر و فرش پوش و فرد و لحاف
ایک میدان جنگ و دشت مصاف
ناقص و نابکار و ناہنجار
کتنے بد وضع کتنے بد کردار
خونِ گندہ بدن میں تھا ان کے
نیشِ عقرب دہن میں تھا ان کے
جنگ و یلغار میں قیامت خیز
اللہ اللہ ظالموں کی گریز
ابھی ڈھونڈا تو جسم پر ہیں رواں
ابھی دیکھا تو آنکھ سے ہیں نہاں

[1] چیتا۔

چھانٹ رکھی تھیں کچھ کمیں گا ہیں
مثلاً پیٹ پنڈلیاں باہیں
معرکہ مجھ سے میرے بستر پر؟
ابھی زیر بغل ابھی سر پر
چار پائی کے شیر جو پائے
ان کا مسکن پلنگ کے پائے
یہ مسہری کے بانیانِ فساد
بان[1] کے بندھنوں سے صاف آزاد
یہ کسی جال میں نہ پھنستے تھے
کھال میں ہولے ہولے دھنستے تھے
پایا زخمی جو تن بدن میں نے
دفعتاً کہدیا بزن میں نے
مورچے دیکھ بھال کر سارے
سو پچاس ایک ہاتھ میں مارے
دیکھ کر یہ جھپٹ یہ جی داری
چند لمحے سکوں رہا طاری
میں یہ سمجھا کہ کھٹملوں کی فوج
دب گئی سر اٹھا کے صورتِ موج

---

[1] جن سے چارپائی کو بُنا جاتا ہے۔

تاک میں تھا غنیم کا عملہ
ناگہاں پشت پر ہوا حملہ
اب جو مونہہ موڑ کر نظر ڈالی
بڑھ گئی اور میری بدحالی
دیکھتا کیا ہوں اک بڑا کھٹمل
اس کے ساتھ اک سپاہ-تیز-اٹل
غالب آ کر طلسم پر میرے
حملہ آور ہے جسم پر میرے
میں نے پھر انگلیوں کو چٹخایا
پھر سے دشت وغا میں در آیا
مارتے مارتے انہیں ہر بار!
ہوگئیں پانچوں انگلیاں خونبار
جانے کس کا نصیب جاگ اٹھا
کہ یکایک غنیم بھاگ اٹھا
دیکھ کر لشکرِ عدو کو خموش
میں بھی بستر پہ پڑ رہا خموش
میں ہی چونکا نہ کچھ عدو چیتا[1]
ایک گھنٹہ اِسی طرح گذرا

---

[1] چیتا۔ یعنی ہوشیار ہوا۔

میرے تن پر کہ سوکھ کر ہے کھڑنک
پھر یکایک کسی نے مارا ڈنک
ڈنک کی وہ چُبھن خدا کی پناہ
دل سے بے اختیار نکلی آہ
اک عدوئے شقی فرومایہ
ہاتھ مارا تو ہاتھ میں آیا
بدنما حلیۂ نمود اُس کا
پیٹ ہی پیٹ تھا وجود اُس کا
قد میں ہر چند فتنہ قامت تھا
لیکن اک مستقل قیامت تھا
اپنے دشمن سے جل کے میں نے کہا
چٹکیوں میں مَسل کے میں نے کہا
کیوں رے گستاخ کیوں اے آوارہ
تو نے سمجھا تھا مجھ کو ناکارہ
او کریہہ الوجود او کالے!
او مرا خون چوسنے والے!
دکھ بڑھاتا ہے غم نصیبوں کا
خون پیتا ہے ہم غریبوں کا؟

جسم میں جن کے تازگی نہ نمو
ان کا کم بخت یہ چوستا ہے لہُو؟
خود حوادث سے ہیں جو زار و نزار
ان غریبوں کے درپئے آزار؟
سُن کے کھٹمل نے یہ مری فریاد
مجھ سے چڑ کر کہا کہ یا استاد!
وقت آخر تو چپ نہ رہنا ہے
کچھ مجھے آپ سے بھی کہنا ہے
گفتگو میں نہ کچھ خلل ڈالیں
بعد کو شوق سے مَسل ڈالیں
مردم آزار جانتے ہیں ہمیں
آپ خونخوار جانتے ہیں ہمیں
ہم سے گستاخیاں جو پیہم ہیں!
کھٹملوں سے حضور برہم ہیں
آہ - ہم بیکسوں پہ صبح و مسا
خون پینے کا طعنہ سبے جا
ہم کہ دس بیس روز جیتے ہیں
تولہ دو تولہ خون پیتے ہیں

آپ کا خون چوسنے والے
ہے اجازت؟ غلام کہہ ڈالے
آپ کا خون چُوستے ہیں حضور
پیر و مُلّا و قیصر و فغفور
غم جو کھاتے ہیں بدنصیبوں کا
خون پیتے ہیں خود غریبوں کا
میرا مطلب یہ ہے مرے سرکار
جو بظاہر ہیں آپ کے غم خوار
آپ کو تھپکیاں جو دیتے ہیں
آپ کا خون چوس لیتے ہیں
یعنی حضرت کے لیڈران کرام!
سخت خونخوار سخت خوں آشام
یہ جو جمہور کے ہیں رکھوالے!
خونِ جمہور چوسنے والے!
سب یہ خونخواریوں پہ مائل ہیں
اور ہم تو غریب کھٹمل ہیں!
پھر بھی اک شور ہے پکڑ کھٹمل
اور موذی کو ہاتھ سے جھٹ مل

جشنِ سالِ نو

پلا ساقی کہ جشنِ سالِ نو ہے
نئے مے کش نئے ساغر نئی مے
یہ جشنِ سالِ نو اللہ و اکبر
نظر آتی ہے یہ دنیا جواں تر
اگرچہ وقت ہے اک بحرِ جاری
ابد کی عظمتیں ہیں اُس پہ طاری
اگرچہ وقت ہے اک بحرِ خاموش
کہ جس میں کوئی فردا ہے نہ ہے دوش
اگرچہ وقت ہے اک موجۂ تیز
کہ ہے برخواست ہی جس میں نہ برخیز
اگرچہ وقت ہے اک سیلِ بیباک
فریبِ ذہن۔ روز و شب کا ادراک
مگر با ایں ہمہ اربابِ تحقیق
ہمیشہ وقت کی کرتے ہیں تفریق
وہ کہتے ہیں کہ وقت از روئے تعمیم
کئی ٹکڑوں میں ہو سکتا ہے تقسیم

کبھی اک ثانیے کی ہے علامت
کبھی یہ وقت ہے صرف ایک ساعت
کبھی یہ وقت اک لمحہ ہے یکسر
کبھی اِس وقت کی قیمت ہے دن بھر
کبھی ہفتہ کبھی یہ اک مہینہ
غرض یہ وقت کیا ہے اک خزینہ
تحائف جس کے ہیں ساعات وایّام
سحر ہے ایک رُخ اور ایک رخ شام
غرض اِس وقت کی ہے ایک قیمت
یہاں انمول ہے ہر ایک ساعت
نہ ہو کیوں جشنِ سالِ نو کہ ہر سال
یہ سالِ نو ہے خود تغیرِ احوال
رواں رگ رگ میں تازہ رَو ہے ساقی
یہ سالِ نو۔ یہ سال نو ہے ساقی
یہ سالِ نو کہ ہے سرنامۂ نو
یہ سالِ نو کہ ہے ہنگامۂ نو
یہ سالِ نو نئے جذبات لایا
نئے تحفے نئی سوغات لایا

یہ سالِ نو کی فتنہ گستری ہے
نئے دستور کی یاد آوری ہے
سُنا ہے قوم کے یارانِ ذی ہوش
کہ ہیں نا اہل اور نامصلحت کوش
خمارِ سالِ نو میں کھو گئے ہیں
نئے دستور میں گم ہو گئے ہیں
نہ کیوں خدّامِ ملّت کو ہو منظور
کہ تحفہ سالِ نو کا ہے یہ دستور
مگر اے سالِ نو۔ گر حسبِ دستور
نہ ہو یہ چیز اگر قسمت کو منظور
اگر دستور سازوں کی چپقلش!
بڑھا دے اور دستوری کشاکش
اگر دستورِ کہنہ کے موافق!
نہ ہو آئین حالت کے مطابق
نیا دستور ہو توہین تازہ!
فقط اک وہم ہو آئین[1] تازہ
پریشاں ہو دل بیتاب اپنا
تو پھر اے سالِ نو آداب اپنا

---

[1] یہ دستور ۲۳ مارچ ۱۹۵۶ء کو نافذ کیا گیا تھا۔ جسے ۸ اکتوبر ۱۹۵۸ء کو مارشل لانے منسوخ کر دیا۔

خونِ بُز

یہی آج رندوں میں ہے پخت و پُز
پلا ساقیا۔ مے نہیں خونِ بُز
یہ خونِ رگِ گردنِ گوسفند
کہ مے سے بھی ہے مستیوں میں دوچند
یہ ذی الحج کی قربانیوں کا لہو
یہ کوثر کا رنگ اور زمزم کی بُو
نہ سوڈے میں وہسکی کے قطرے مِلا
پلا خونِ حلقومِ دنبہ۔ پلا!
وہ خونِ جہندہ کہ ہے گرم تاب
وہ افشردۂ آتشیں کا جواب
یہ بکرے کی خوش فعلیوں کا نچوڑ
کہ ہے اپنی تلخی میں ٹھرّے[1] کا جوڑ
خُمِ پختہ سے مت مۓ خام۔ بھر
ذبیحے کے حلقوم سے جام بھر
نہ رَم میں برانڈی نہ جِن میں بیئر
یہ زحمت نہ کر ساقیٔ خوش ریر

---

[1] کچی شراب۔

اگر یخنیٔ و شوربہ کا ہو میل
تو پھر سب سے بہتر ہے یہ کاک ٹیل
کھلا لحمِ بُز اور محفل کو سج
پلا آبِ زمزم بہ تقریبِ حج
بہ تقریب حج ۔ آب زمزم پلا
کہ زمزم ہے تقریبِ حج کا صلہ
اگر خونِ دنبہ ہے گرم و ثقیل
تو بکرے کی یخنی کی کوئی سبیل
سبھی عید قرباں سے پُرجوش ہیں
جو مے نوش تھے شوربہ نوش ہیں
جو پینے پلانے میں نقصان ہے
تو کھانا مسلماں کا ایمان ہے
خدا را نہ جام مئے ناب دے
کوئی قورمے سے بھری قاب دے

بیادِ شہیدانِ غدر

عیاں ہو گئی صورتِ شرحِ صدر
بیادِ جہادِ شہیدانِ غدر

خوشا یادِ زحمت کشانِ جہاد
طبیعت میں پیدا ہوئی اک کشاد

قلوب اُن کے جوشِ شجاعت سے پُر
جوانانِ آزاد و مردانِ حُر

فرنگی ملوکیّت و تاج سے
وہ باغی تھے انگریز کے راج سے

پیامِ وفا دے گئے چار سو
خود اپنے لہو سے ہوئے سرخ رُو

جو تھے ناامیدی میں عینِ اُمید
وہ جانِ شہادت وہ قومی شہید

بڑھی جن سے اِس خاک کی آبرو
خوشا خطّۂ دہلی و لکھنو!

ملامت گروں نے زراہ عتاب
دیا ہے انہیں باغیوں کا خطاب

لہ مئی ۱۹۵۰ء میں جہادِ آزادی ۱۸۵۷ء کی صد سالہ یادگار منائی گئی تھی۔

شریف و غیور ویلِ[1] ارجمند
حقیقت میں وہ تھے بغاوت پسند
غلامی کی لعنت سے باغی تھے وہ
غلامانہ فطرت سے باغی تھے وہ
وہ باغی تھے افرنگ کے تاج سے
وہ باغی تھے انگریز کے راج سے
وہ باغی تھے محکومیٔ غیر سے
وہ باغی تھے اشرار کے خیر[2] سے
وہ تھے دشمنانِ وطن کے حریف
وہ تھے سامراجی چلن کے حریف
یقیناً بغاوت تھی اُن کے خلاف
جو خود غدر پیشہ تھے بے اختلاف
نفاق و ریا میں بہت تیز تھے
حقیقت میں غدّار ۔ انگریز تھے
وفا سے نفاق اور الفت سے غدر
انہوں نے کیا ہر صداقت سے غدر
اگر حرّیت دوست بدکار ہیں
تو پھر غدر والے بھی غدّار ہیں

[1] مرد پہلوان [2] خیر سے ۔ محاورہ ہے ۔

مگر غدر کو غدر کہتے ہیں وہ
اِن اوہام باطل میں رہتے ہیں وہ
جنہیں قدرِ آزاد مرداں نہیں
جو دانش ورِ عزم انساں نہیں
خوشا مردِ آزادۂ حریّت
پِلا ساقیا! بادۂ حریّت
وہ مے جس سے اُبھرے دلوں کی اُمنگ
وہ مے جس میں خونِ شہیداں کا رنگ
جو یکتا ہے ہر روپ ہر رنگ میں
جو چلتی ہے مے خانۂ جنگ میں
شجاعت کے منزل نوردوں کی مے
وہ بے باک آزاد مردوں کی مے

تقریبِ استقلال

کیوں عالمِ کیف ہو نہ دہ چند
یہ قوم کا عشرۂ ظفر مند
شایاں ہے جہاں میں ہر صفت کی
تقریبِ دہم یہ حرّیت کی
دسویں یہ بہارِ کامرانی
دہ چند ہے اس کی نوجوانی
سو جان سے اس دہم پہ جی دیں
دس جشن کیا دس ہزار عیدیں
ملّت ہو ہزار دل سے قرباں
آزادی کا سال وہ بھی دسواں
سلمائے ظفر کہ اک دُلہن ہے
اب سالِ دہم میں گامزن ہے
آزادیٔ قوم کی یہ تقریب
ملّت کو پیامِ ضبط و تادیب
اللہ رے عشق کا یہ جلوہ
مبہوت ہیں خود عقولِ عشرہ[1]

---

[1] بعض مکاتیبِ فلسفہ نے عقل کے دس درجے قرار دیئے ہیں۔

نادر ہے یہ حرّیت کا مضموں
دس بار کیا ۔ لاکھ بار کہدوں
یہ روزِ سعید اے جواں مرد!
دس ہی میں نہیں ہزار میں فرد
اِس ساعتِ خوش نما میں پیہم
پھرتا ہے نگاہ میں وہ عالم
جب قوم کا ہر بشر حزیں تھا
آزادی کا سالِ اوّلیں تھا
آزادی کا سج رہا تھا جب تخت
وہ عیسوی سال چہلم و ہفت
جب امن کا چاند گہہ رہا تھا
اِس خاک پہ خون بہہ رہا تھا
جب روحِ خلوص تھی نہ زندہ
انسان تھا اِک شقی درندہ!
ہر فرد کے ہاتھ میں تبر تھے
ہر شخص کی ٹھوکروں میں سر تھے
ہر لب پہ تھی اک پکار ۔ مارو
ہر دل کو تھی مارا مار ۔ مارو

مارو کہ ہے موت زندگانی!
ہر موت ہے ذلت کی نشانی!
سرہانے بریدہ کے تماشے
سڑکوں پہ پڑے ہوئے تھے لاشے
کتنے تھے کہ تھے وطن سے بیزار
ماں باپ سے اور بہن سے بیزار
جب گھر میں نہ تھا کوئی ٹھکانہ
لاکھوں کو تھی فکرِ ترکِ خانہ
شرنارتھی[1] اک طرف تھے بیدم
اک سمت مہاجرین پُر غم
دونوں کا یہ فیصلہ تھا جانا
گھر پھونک کر دیکھئے تماشا
ہندو نے جو مندروں کو چھوڑا
مونہہ ہم نے بھی مسجدوں سے موڑا
وہ کشورِ پاک سے تھے بیزار
بھارت کی حدود میں تھے ہم خوار
وہ ہم سے جو تھے نفور و نافر
ہم اُن کو بتا رہے تھے کافر

---

[1] شرنارتھی۔ تارکین وطن۔

شرمسار تھی وہ ہوئے جو مٹ کے
ہم لُٹ کے مہاجرین ٹھہرے
ہم کشورِ پاک میں حزیں ہیں
وہ ہند میں ہیں مگر نہیں ہیں
وہ بھی ہیں وہاں نئے نئے سے
ہم بھی ہیں یہاں گئے گئے سے
القصہ وہ سالِ چہلم و ہفت
خوش بخت ہو پھر بھی لاکھ بدبخت
آتی ہے جو یادِ ترکِ خانہ
پھرتا ہے نظر میں وہ زمانہ
جب ہم نے برائے کشورِ پاک
ڈالی تھی وطن کی خاک بر خاک
اے دل! یہ کہاں کا ذکر چھیڑا
چھوڑ اِس کو یہ غم کا ہے بکھیڑا
آ۔ جشنِ حیاتِ نو منائیں
اس سالِ دہم کے گیت گائیں
کیوں عالمِ کیف ہو نہ دہ چند
یہ قوم کا عشرۂ ظفر مند

عرب نامہ

اے عرب کے ولولوں کے ترجماں!
کچھ عرب کے ولولوں کی داستاں[1]
سرگذشتِ ملّتِ بے تاب کہہ
قصّہ بیداریٔ اعراب کہہ
اے عرب کے راویٔ شیریں مقال
بامزہ ہو کر سنا مصری کا حال
قدس کا دلکش فسانہ چھیڑ دے
شرقِ اردن کا ترانہ چھیڑ دے
روح میں ہے اضطرار و اشتیاق
چھیڑ کوئی نغمۂ سازِ عراق[2]
پھر سنا دے اے نقیبِ کوہ و دشت
شام و لبنان و یمن کی سرگذشت
ہاں ذرا دُہرا بصد سوز و گداز
داستانِ ترکِ تازانِ حجاز
باز گو از نجد و از یارانِ نجد
تا در و دیوارہا آری بہ وجد

---

[1] عرب ملکوں میں انقلابی تحریکیں وسعت پذیر تھیں۔ [2] عراق ایک راگنی کا نام بھی ہے۔

ریگ زاروں میں بھڑک اٹھی ہے آگ
آگ - صحرا کے حُدی خوانوں کے راگ
مشرقِ وسطیٰ کی بیداری بھی دیکھ
انقلابِ نو کی تیاری بھی دیکھ
از عدن تا حدِّ بیروت و دمشق
عشق بے شک معرکہ آرا ہے عشق
ہاں قدم آگے بڑھا تعجیل سے
جنگ ہے درپیش اسرائیل سے
وارثِ عزمِ براہیمی ہیں ہم
مسجد اقصیٰ کے شعلوں کی قسم
الحذر جنگ جوانانِ عرب
الاماں عزمِ شجاعانِ عرب
تھا عرب کا چند صدیوں سے یہ حال
خستہ و زار و زبوں و پائمال
مشرقِ وسطیٰ تھا گو بیزارِ غرب
شرق پر غالب تھا استعمارِ غرب
گر رہے تھے مشرقی قوموں کے تاج
سب پہ حاوی تھا فرنگی سامراج

غرب کی ہر قوتِ شیطانیہ
پرتگال اسپین ۔ اور برطانیہ
بلجیئم یونان اٹلی ڈچ فرانس
بن چکے تھے سینۂ مشرق کی پھانس
ایشیا کی خاک ۔ افریقہ کی خاک
سامراجی ڈاکوؤں سے بیم ناک
ارضِ مشرق کے وسائل سربہ سر
آب و خاک برق و بادو بحر و بر
وقفِ استعمار و استحصال تھے
سامراجی جبر سے پامال تھے
ایشیا مرکز تھا گنج و مال کا
اک خزانہ قدرتی اموال کا
اللہ اللہ شرق کا فیضان عام
ہر طرف لا انتہا اجناسِ خام
مشرقی خطوں میں تھے بالا و پست
چاندی سونا کوئلہ فولاد جست
لاگ کرنے کو نہ کچھ کم تھی یہ لاگ
تیل نے کچھ اور بھڑکائی تھی آگ

مغربی قوموں کا استحصالِ عام!
ایشیا کو تھا غلامی کا پیام
مشرقِ وسطیٰ تھا محتاجِ فرنگ
سب عرب قومیں تھیں "تاراجِ فرنگ
لیجئے صدیوں کا اب ٹوٹا جمود
انقلابِ نو کا باعث ہیں یہود
موت دادِ زندگی دینے لگی!
زندگی انگڑائیاں لینے لگی!
اے عرب کے ولولوں کے ترجماں
وہ عرب کی نیم خوابی اب کہاں؟
اب کہاں وہ بندگی پر افتخار
اب کہاں وہ خواجگی کا اقتدار
یہ حیاتِ ثانیہ کے ولولے
یہ عرب قوموں کے زندہ حوصلے
مرحبا اے رحمتِ رحمانیہ!
اھلاً وسہلاً حیاتِ ثانیہ

تشنگی نامہ

ہرگز نہیں احتیاجِ بادہ!
ساقی! مجھے صرف آبِ سادہ
تا چند شرابِ ارغوانی
پانی فقط ایک گھونٹ پانی
افراطِ شرابِ ناب کب تک
اِس شہر میں قحطِ آب کب تک
زمزم کا ہو نرخ اِس قدر تیز
ہر چند کہ مے کدے ہیں لبریز
پانی کی ہے اِس قدر گرانی
سقّے ہیں حیا سے پانی پانی
اُف قلّتِ آب سے یہ زشتی
بے آبرو ہو گئے بہشتی
حمّام میں پڑ گئے ہیں تالے
جاری ہیں لبوں کے نل سے نالے
بے آب نہیں ہیں صرف مردُم[1]
موتی سے بھی آب ہو گئی گُم

---

[1] مردم کے معنی دو ہیں۔ آدمی اور آنکھ کی پُتلی۔

آئینے کی آب و تاب غائب!
ہے تاب ضرور آب غائب
ہر کشت ہے تشنہ کام و مایوس
بادل ہیں مگر بلا کے کنجوس
ہر چند اٹھی اُفق سے بدلی
موسم کی روش ذرا نہ بدلی
پائپ کا یہ حال ہو رہا ہے
خاموش پڑا ہے رُو رہا ہے
غیرت کی نہیں کوئی نشانی
آنکھوں سے بھی اُڑ گیا ہے پانی
وہ سندھ کا آبِ زندگانی!
وہ بحرِ عرب کا شور پانی
پانی نہ ہو بستیوں کے اندر
پہلو میں ہو شہر کے سمندر
چنگاریاں آسماں سے برسیں
اک بوند کو جاندار ترسیں
ساون کا یہ دلربا مہینہ؟
گرمی کا یہ جاں رُستاں قرینہ؟

پیدا نہیں ہاں سون اب تک
کیوں خشک ہے ماہ جون اب تک
نایاب کیوں شہر میں ہے پانی
دشوار نہیں یہ بات پانی !
بستی میں جو ہے ذخیرۂ آب
جمہور کے واسطے ہے کم یاب
ہیں شہر میں جتنے آبرو دار
حکّام ۔ غنی ۔ شریف ۔ رُو دار[1]
جو لوگ ہیں آبروئے ملّت
پانی کی نہیں ہے اُن کو قلّت
مرتے ہیں جو لوگ بھوکے پیاسے
مرجائیں حضور کی بلا سے
خود میرا نصیب ہے جو کھوٹا
لوٹا مرا ۔ بوند بھر کو لُوٹا[2]
مٹکی مری راہ سے نہ بھٹکی
اِک قطرۂ آب پا کے مٹکی[3]
القصّہ یہ قحطِ آبِ سادہ
واجب ہوا اب حصولِ بادہ

---

[1] وجیہہ ۔ باعزت [2] لوٹا یعنی تڑپا ۔ بیتاب ہوا ۔ [3] مٹکنا سے مٹکی یعنی چٹخ گئی ۔

مشکل ہے جو فیضِ آب ساقی
ڈٹ ڈٹ[1] کے شرابِ ناب ساقی
میں جِن ہوں تو جام جِن سے بھر دے
پانی کا ہے قحط تو بیئر دے
کیا ہے جو رسد ہے آب کی کم
رَم[2] مجھ سے نہ کر مجھے پلا رَم[3]
نیّت مری تشنگی میں کھسکی!
وہسکی وہسکی رئیسؔ وہسکی
ہیں یوسفِ مصرِ تشنہ کاماں
ہستی مری صرف چاہِ کنعاں
حاصل نہیں آبِ خود پرستی
اندھا سا کنواں ہے میری ہستی
غنچہ جو ہے قلب کا وہ کھِل جائے
پانی نہیں تو شراب مل جائے
کوثر نہ لبن نہ مے نہ زمزم
اللہ یہ تشنگی کا عالم
سقّے ہیں شقی۔ خیس پانی
پانی پانی رئیسؔ پانی!

---

[1] GIN (شراب کی ایک قسم) [2] رم کرنا۔ گریز کرنا۔ [3] RUM۔ شراب کی ایک قسم۔

دورِ نَو

نہیں کچھ ترے رند سبزی فروش
اِدھر آ۔ ارے ساقیٔ سبز پوش
بہار آئی گلزار ہے سبز رنگ
پلا جھوم کر ایسے عالم میں بھنگ
مگر ہاں تقاضے ہیں محفل کے اور
چلے بزم میں سبز چائے کا دور
فضا سبز پرچم کی کچھ اور ہے
خبر ہے تجھے لیگ کا دور ہے
مسلماں پہ یہ لیگروں کا کرم
ہوئے پھر مشرف بہ اسلام ہم
شریعت کی لیگ آفرینی تو دیکھ
ذرا لیگ کا فیض دینی تو دیکھ
تمسک ہے مومن کا قرآں کے ساتھ
مسلماں نے سنّت پہ ڈالا ہے ہاتھ
ہر اِک برگ و بار و شجر سبز ہے
چمن لیگ کا سر بہ سر سبز ہے

نہیں بادۂ سرخ کی احتیاج
وطن میں ہوا سبز پوشوں کا راج
بہ اکرام و افضالِ ربانیہ
خوشا لیگ کی نشأۃ ثانیہ
ابھی تک تو یہ لیگ تھی پُر فساد
کہ تھا اِسکی رگ رگ میں فاسد مواد
کئی سال سے زخم خوردہ تھی لیگ
وفورِ جراحت سے مردہ تھی لیگ
مگر عالمِ نزع میں ناگہاں
بڑھا چارہ سازوں کا اک کارواں
سفینہ کنارے پہ آکر لگا!
لگا اس کے زخموں پہ نشتر[1] لگا
وہ نشتر وہ چارہ گرِ زخمِ دل
وہ نشتر کہ ہے نشترِ زخمِ دل
زبسکہ یہ ہے لیگ کا دور نو
سیاست کا ہے طرز۔نو۔ طور۔نو
مئے کہنہ اِس دور میں مت پلا
پلا لیگ کا جامِ صحت پلا

---

[1] مسلم لیگ کی تنظیم نو کی گئی تھی اور سردار عبدالرب نشتر مرحوم کو مسلم لیگ کا صدر منتخب کیا گیا تھا۔

مجھے لیگ کے رنگ میں رنگ دے
مئے سرخ جائز نہیں بھنگ دے
یہ سُوجھی ہے مے کی تلافی مجھے
فقط سبز چائے ہے کافی مجھے
یہ ہنگامِ بادہ پرستی نہیں
نہیں اب مجھے تابِ مستی نہیں
خوشا یہ ارا کینِ ذی قدرِ لیگ
وہ صدرِ وزارت کہ ہوں صدرِ لیگ
غرض یہ کہ ان کا وطن میں ہے راج
جو ازروئے طینت ہیں صوفی مزاج
جہادِ عمل کے مجاہد ہیں یہ
کہ درویش و ملّا و زاہد ہیں یہ
رحیماً غفوراً شکورا کا دور
چلے بس شراباً طہورا کا دور
محدّث[1] نہ اب اہلِ قرآن کر
الٰہی! مجھے تو مسلمان کر

[1] اہلِ حدیث اور اہلِ قرآن کے نام سے بھی دو فرقے وجود میں آگئے ہیں۔

عہد آفریں

طلب کے دُرود آرزو کے سلام
ترے نام ساقی! تری مے کے نام
تری مے اک ایفائے عہدِ آفریں
تری مے کشی ۔ عہدِ عہد آفریں
تری مے ۔ مریدوں کے حسبِ مراد
مۓ وحدت و مستیٔ اتحاد
یوں ہی دادِ مے ۔ میرِ مے خانہ دے
جو پیماں کیا تھا وہ پیمانہ دے
مۓ خوبی و خیر و صلح و صلاح!
بیادِ لیاقت بنامِ جناح
وہی مے ۔ جو افشردۂ تاک ہے
جو آلائشِ تاک سے پاک ہے
نئی زندگی کا اشارا جو ہے
نئے عہد کا استعارا جو ہے
مۓ ناب یعنی مۓ ارضِ پاک
عجب مے ہے دشمن کی آنکھوں میں خاک

نہ بادہ نہ ساغر نہ مستی کی مے
ملے اب تو ملّت پرستی کی مے
خُمِ غیر پہ ہاتھ کب تک دراز
مےَ خانۂ جاں مےَ خانہ ساز
وطن کی محبّت کی مے ساقیا
عمل کی اخوّت کی مے ساقیا
اِسی خُم اِسی خاک سے عشق ہے
ہمیں کشورِ پاک سے عشق ہے
یہی خاک ہے خاکۂ بزمِ جَم
اِسی خُم کے آگے مرا سر ہے خم
یہی ارضِ پاکی - یہی ارضِ پاک
یہی کاخِ[1] پاکاں یہی پاک خاک
سرِ خُم - خدا کی قسم کھول دے
مگر اِس میں خاکِ وطن گھول دے
یہ خاک اُن شہیدوں کا ہے خوں بہا
کہ جن کا ہمارے لئے خوں بہا
جو ہم پر سے صدقے اتارے گئے
جو راہِ محبّت میں مارے گئے

---

[1] کاخ کے معنی ہیں محل - پاکاں یعنی پاکستانی

قائدِ سیاست کے نام

اے چُھک چُھک انجنِ سیاست
اے دھک دھک موٹرِ قیادت
اے کُھد بُد ہانڈیٔ تقاریر!
اے چھم چھم زیورِ تدابیر
اے پَھٹ پَھٹ ٹائرِ وزارت
اے غٹ غٹ شربتِ حکومت
اے پُھس پُھس محفلِ بیانات
اے کُھس کُھس خلوتِ خیالات
اے گِھس گِھس خامۂ دفاتر
اے ٹخ ٹخ تانگۂ مہاجر
اے ٹُک ٹُک رسٹ واچِ ملّت
اے ٹن ٹن گھنٹۂ قیادت
اے ٹپ ٹپ بارشِ تدبر
اے سر سر آندھیٔ تفکّر
اے کِل کِل دانتۂ دلائل
اے پٹ پٹ پلکۂ مسائل

اے دھپ دھپ ڈھولک عوامی
اے دھڑ دھڑ تختِ انتظامی
اے ہَپ ہَپ حلوۂ سیاسی
اے کُرکُر نانِ خود شناسی
اے لَٹ لَٹ گیسوئے تجمّل
اے فٹ فٹ پرزۂ تخیّل
اے دھم دھم پایۂ رہ نمائی
اے جَھل جَھل رختِ خود ستائی
اے سڑ سڑ سالنِ مناصب
اے گڑ گڑ حقۂ مراتب
اے بَک بَک بحثِ نامکمل
اے جَھک جَھک گفتگوئے مہمل
اے مردِ جہانِ نیک مردی
اے[1] سُہر کے بعد صرف وردی
آزادیٔ قوم کی یہ تقریب
یہ جشنِ طرب بحُسنِ ترتیب
اے رہبرِ محتشم مبارک
اے قائدِ محترم مبارک

[1] حسین شہید سہروردی

کرکٹ نامہ

لائقِ حمد ہے وہ پاک خدا
گیند بلّے[1] کو جس نے خلق کیا
گو۔ و۔ چوگاں کا خالقِ اکبر
صانعِ بازیٔ قضا و قدر
یہ زمیں آسماں یہ سیّارے
اُس کی قدرت کے کھیل ہیں سارے
کون سرِّ ازل سے ہے آگاہ
دوجہاں کیا ہیں؟ اُس کے بازی گاہ
نکتہ ہائے ازل خدا کی قسم
سیکھ سکتے ہیں کھیل کھیل میں ہم
کس زباں سے ہو گیند کی تعریف
ہے یہ اک نکتۂ عجیب ولطیف
کیجئے گیند کے وجود پہ غور
کیا مدّور ہے اور کیسا دور
گیند کو آپ جانیئے نہ مخول
دیکھئے ساری کائنات ہے گول

---

[1] ابتدا ہی سے پاکستان میں کرکٹ اور ہاکی کی گرم بازاری رہی ہے اور آج تک یہی حال ہے۔

کیا یہی شکلِ کائنات نہیں
صاف ہے۔گول مول بات نہیں
کرۂ خاک گیند کی صورت
ہفت افلاک گیند کی صورت
گوئے زرّیں ہے آسماں پہ قمر
آتشیں گیند خسروِ خاور
شرحِ اجمال یہ کہ ارض و سما
گیند کی شکل پر ہوئے پیدا
دَور۔ افلاک کا مقدّر ہے
جو بھی شے ہے یہاں مدّور ہے
شکلِ تکوین کا اشارہ ہے
گیند خلقت کا استعارہ ہے
گیند کو آپ جانیئے نہ حقیر
ہے یہ اِس کائنات کی تصویر
صانعِ کُل کو کس قدر بھائی
صرف اِک شکل یعنی گولائی
تول میزانِ فہم و فکر میں تول
اور اقرار کر کہ عقل ہے گول

موت ہی کب فقط مدوّر ہے
زندگی خود بھی گول چکّر ہے
چرخ کی طرح دور میں دن رات
وقت کا ایک دائرہ ہے حیات
گو۔و۔چوگاں نہ کیوں ہوں ہم پلّہ
گیند کے ساتھ ساتھ ہے بلّا
جبرِ تقدیر سے گریز کہاں؟
خلق ہے گیند۔حُکمِ حق چوگاں
زندگی ریل پیل ہے گویا
گیند بلّے کا کھیل ہے گویا
جب مقدّر کے وار چلتے ہیں
گیند کی طرح ہم اُچھلتے ہیں
کیا ہے یہ عرصۂ زمین و زماں
کرکٹ کا وسیع تر میداں
مہر و ماہ و ستارہ و افلاک
کرۂ باد و آب و آتش و خاک

حرکت ہائے تند و تیز میں ہیں!
گیند کی طرح جُست و خیز میں ہیں
زیست کو ٹسٹ میچ سمجھے ہیں
موت کو ایک کیچ[1] سمجھے ہیں
جس قدر ہیں جہاں میں اہلِ شعور
کرکٹ میچ دیکھتے ہیں ضرور
یہ جہاں یہ ہماری جائے پناہ
کیا ہے؟ قدرت کی ایک بازی گاہ
اب یہ سمجھے ہیں زندگی کھو کر
زندگی گیند ہے قضا ٹھوکر
زندگی کیا ہے؟ چند روزہ چھُوٹ
وقت آیا تو ہو گئے آؤٹ[2]

---

[1] CATCH   [2] OUT

بنگال نامہ

کہتا ہے یہ راویٔ خوش اقوال
مشرق میں ہے اک بہشتِ بنگال
وہ خطّۂ پاک۔ چشمِ بد دور
ہے ارضِ سحر تو مطلعِ نور
اللہ رے وہ دیارِ شاداب
وہ خاک۔ صد آب ہے نہ پنج آب
نزہت کدۂ نشاط انگیز
زرخیز زمیں فلک گہر ریز
جاگیر ہیں ابر و باد اُس کی
برسات ہے خانہ زاد اُس کی
گر اُن کو نچوڑیں یا نتھاریں
ذرّوں سے ٹپک پڑیں بہاریں
پنہاں ہے وہ جوش اُن کے اندر
قطروں سے اُبل پڑیں سمندر
اللہ وہ جاں فزا ہوائیں!
اللہ وہ سرمئی گھٹائیں!

وہ خاک کے دل رُبا نظارے
گردوں پہ شریر ابر پارے
زرخیز زمیں وہ نقرئی ریت
تا حدِّ نظر وہ دھان کے کھیت
با وصفِ کساں بے نوائی
وہ جوٹ کا ریشۂ طلائی
اک کانِ طلاء ہے کونا کونا
ہر کھیت اُگل رہا ہے سونا
المختصر یہ بہشتِ بنگال!
اک عالمِ کہنہ و جواں سال
آیئنہ خلد و خلد آئیں!
دریا دل و کوہسار تمکیں!
خشکی ہیں بھی خشکیاں ہیں نایاب
بستی ہیں جو بس گئے ہیں تالاب
سبزے نے یہ دھوم ہے مچائی
ہر شے پہ جمی ہوئی ہے کائی
اِس خاک کا کیا بیاں کہ یہ خاک
ہے سرمۂ چشم خطّۂ پاک[1]

---

[1] افسوس کہ یہ سرمۂ چشم خطۂ پاک دسمبر ۱۹۷۱ء میں ہم سے روٹھ گیا۔

یہ صوبۂ دل کشا و شاداب
غیرت دِہ سندھ و رشکِ پنجاب
مشکل نہیں جان و دل کے سودے
ہر رنگ کے پھول اور پودے
رعنائیاں وہ کہ جنّتیں دنگ
رنگینیاں وہ کہ سحر و نیرنگ
نیرنگِ بہار کا عجوبہ!
منصوبۂ رنگ ہے یہ صوبہ
تا حدِّ نظر تمام راہیں
ہیں لشکرِ گُل کی خیمہ گاہیں
یاں روحِ نمو کو کیا گِلہ ہے
ہر گام پر اِک چمن کھِلا ہے
ملّت کا ہے خانہ باغ۔ بنگال
پنجاب ہے دل۔ دماغ۔ بنگال
تزیین وطن کا جس سے خاکہ
اِس نقش کا وہ نگیں ہے ڈھاکہ
وہ عظمتِ کہنہ کی نشانی
مُغلوں کی قدیم راجدھانی[1]

[1] جہانگیر نے ڈھاکہ کو جہانگیر نگر کا خطاب دیا تھا۔

ماضی کا دیارِ حُسن و تنویر
آئینہ عظمتِ جہانگیر
ڈھاکے کی صفت ہو کیا کہ یہ شہر
پہلے سے رہا ہے شہرۂ دہر
ہر چند کہ بے پناہ تھا یہ
ملّت کی پناہ گاہ تھا یہ
جب گردشِ وقت سے تھے حیراں
اِس بّرِصغیر کے مسلماں
اِس وقت یہیں بہ عزمِ عالی
ملّت نے بِنائے لیگ[1] ڈالی
سچ ہے کہ یہیں سے ہے بصد ناز
تحریکِ حیاتِ نو کا آغاز
کیا اِس میں شریک تھا کوئی اور؟
دلّی ہو کہ لکھنؤ و لاہور!
قدرت کے کرم نے جس کو "تاکا"
وہ شہر تھا ابتدا میں ڈھاکہ
منزل گہِ راہِ قوم اب بھی
ڈھاکہ ہے پناہِ قوم اب بھی

---

[1] ڈھاکہ میں ۱۹۰۶ء میں مسلم لیگ کے قیام کا فیصلہ کیا گیا تھا۔

الزبتھ نامہ

اے کشورِ پاک و پاک کشور
تابندہ و تابناک کشور
اللہ رے آب و تاب تیری
تقدیر ہے لاجواب تیری
ازراہِ فیوضِ بادشاہی!
بخشندۂ شانِ کج کلاہی!
سلطانۂ و شہریارِ انگلینڈ
مخدومہ و تاجدارِ انگلینڈ
اِس خاک پر جلوہ گر ہوئی ہے
جلوہ دِہ بحر و بر ہوئی ہے
شہزادیٔ بحر و بر ہے آخر
سلطانۂ خشک و تر ہے آخر
مسجودۂ بندگانِ دولت
مخدومۂ خادمانِ صولت
سب دنگ ہیں جلوہ و ضیا سے
انجم کی نمود نقشِ پا سے

ــــ یہ مثنوی ملکہ ازبتھ کے دورہ پاکستان کے موقع پر طنزیہ لہجے میں لکھی گئی تھی۔ لیکن بعض کم ذوق حضرات نے اسے قصیدہ [illegible] لکیا یعنی سخن فہمی عالم بالا معلوم شد۔

کس شان سے وہ رواں دواں ہے
راہوں پہ گمانِ کہکشاں ہے
ذرّوں کی روش بدل رہی ہے
خورشید کی چال چل رہی ہے
اربابِ نظر ادب سے جھانکیں
راہوں میں بچھی ہوئی ہیں آنکھیں
اللہ رے وہ جلوسِ شاہی
امواجِ نسیمِ صبح گاہی!
جنبش میں ہے کاروانِ اجلال
چلتی ہے ہوائے فتح و اقبال
ہر بندۂ بندگانِ عالی
ہر ایک حوالی و موالی!
باہر نہ ہو جادۂ طلب سے
حاضر ہو قرینۂ ادب سے
ملکہ کا یہ موکب ہمایوںؔ[1]
اِس خاک پہ؟ بس وہی ہے مضموں
پیاسوں کی زمیں پہ چشمۂ مُل
کانٹوں کے وطن میں خسروِ گُلؔ[1]

---

[1] یہ سب طنزیہ اشعار ہیں۔ موکب کے معنی ہیں جلوس۔

دنیائے عزا میں جلوۂ عید
ذرّات کی انجمن میں خورشید
پستی میں عروج - سوز میں ساز
کنجشک کے گھونسلے میں شہباز
آنکھیں ہیں تجلّیوں سے خیرہ
جُھلسے ہوئے کوئلوں میں ہیرا
یہ شان ہے اور کیوں نہ ہوتی
دریا میں صدف صدف میں موتی
جلووں کی یہ شان - چشم بد دور
فانوس میں لَو چراغ میں نور
سوکھے ہوئے بادلوں میں پانی
الفاظ کے دیس میں معانی
گونگے کی پکار میں فصاحت
بہرے کے دیار میں سماعت
سلطانہ و شہریار انگلینڈ
مخدومۂ و تاجدار انگلینڈ
اِس خاک پہ جلوہ گر ہوئی ہے
گذری شب غم - سحر ہوئی ہے

نئی زبان

فکر میں ہے ہر ایک صاحبِ فکر
ہر زباں پر نئی زباں کا ہے ذکر
خوش بیانوں میں ہیں بیاں اِس کے
صدرِ ملّت ہیں ترجماں اِس کے
وحدتِ قوم کا نشاں کیا ہے؟
ہم سے پوچھو نئی زباں کیا ہے؟
کشورِ پاک ہے زروئے سخن
مختلف بولیوں کا ایک چمن
سندھ و پنجاب و سرحد و بلوچ
ہر مقامی زباں میں ہے کوئی لوچ
صاف اردو میں ہے صفائی اور
پاک بنگلہ میں دلربائی اور
شعر و نغمہ کا ڈھنگ فکر کا ڈھب
سب کے اپنے ذخیرہ ہائے ادب
لفظ و معنی کی نرم رو ندیاں
جن پہ گذری ہیں سینکڑوں صدیاں

ـــہ مرحوم صدر ایوب کی تجویز تھی کہ مشرقی و مغربی پاکستان کی تمام بولیوں کے امتزاج سے نئی قومی زبان بنائی جائے۔

گو کہ اِن میں سے ہے ہر اک بولی
باہم اِک دوسرے کی ہم جُولی
پھر بھی کوئی زبانِ عام نہیں
قوم کی ترجمانِ عام نہیں
گو کہ آپس کی ہم زبانی سے
بلکہ خود فطرتِ لسانی سے
رفتہ رفتہ بہ صورت تقریر
اٹھ رہا ہے نئی زباں کا خمیر
چھپ سکیں گے کہیں کمال اُس کے؟
اب بھی واضح ہیں خدّوخال اُس کے
قومیّت کی جو ترجماں ہوگی
قوم کی مشترک زباں ہوگی
قوم کی اِس نئی زباں کا قوام
مختلف بولیوں کا طرزِ کلام
جس سے سندھی کا ارتباطِ کہن
جس میں بنگلہ زباں کا میٹھا پن
جس میں پنجاب کی زباں دانی
جس کا اِک ۔ رنگ روپ ۔ ملتانی

کھوج پایا جو دور کی سوُجی!
جس کا اِک خاص روپ بلوچی
جس میں ہندی کی نے نوازی بھی
اور ترکی کی ترک تازی بھی!
کیا گراں قدر کیا گراں پایہ؟
عَرَبی فارسی کا سرمایہ!
جس کی تحریر جانی پہچانی:
حرف جس کے حروفِ قرآنی
کام کی بات کام کی بولی
سیدھی سادھی عوام کی بولی
عام لوگوں میں گھومنے والی
سب کے ہونٹوں کو چومنے والی
شوخی و سادگی کچھ اِس حد کی
نظم حاؔلی کی نثر سیّدؔ[1] کی
عکس ہر ایک فن کے خاتم کا
مظہر و آرزو و حاتم[2] کا
اس میں سودا کی حرف گیری بھی
میر صاحب کی شانِ میری بھی

[1] سرسیّد [2] مظہر جانجاناں۔ شاہ مبارک آرزو۔ حاتم۔ مرزا سودا میر تقی۔ اردو کے قدیم اساتذہ۔

جس میں اَلَسْتَ کا جوہرِ گفتار
مصحفی کا صحیفۂ افکار
پالیا اِس میں جب بھی کاوش کی
زور ناسخ کا آنچ آتش کی
جس میں ہر اہل فن کا قول سند
شبلی آزاد اور نذیر احمد
لفظ سادہ سلیس ہوں جس کے
دل سے طالب انیسؔ ہوں جس کے
خوش بیانی کا اِستعارا ہو
جس کو اقبال نے سنوارا ہو
جو مسخّر عوام کو کر لے
غیر ملکی زباں سے ٹکّر لے
جس میں رنگت نہ ہو دورنگی کی
چھاپ جس پہ نہ ہو فرنگی کی
عام لوگوں کی بول چال کہیں
بلکہ جس کو زبانِ حال کہیں
اپنی وحدت کی ترجماں ہے یہی
فی الحقیقت نئی زباں ہے یہی۔

تنقید

تنقید کا اصول ہے جمہوریت کی جان!
مسلک ہے ناقدانِ وطن کا مگر غلط
یہ کیا کہ جب بھی حضرتِ ناقد کے لب کھلے
ہر شے کو کہہ دیا کہ یہ ہے سر بہ سر غلط
آیا جو مدحِ ظلمتِ شب کا کبھی خیال
دعویٰ کیا کہ جلوۂ نورِ سحر غلط
تعریفِ ظلم وجہل کی منظور جب ہوئی
نعرہ لگا کہ دعوئ علم و خبر غلط!
ذرّاتِ خاک کو جو کبھی سر چڑھا لیا
کہنے لگے کہ منزلِ شمس و قمر غلط
جب خار و خس کے وصف میں نغمہ سرا ہوئے
بولے کہ سودمندئ برگ و ثمر غلط
سسٹم منسٹری کا غلط ہو کہ ہو درست
تنقید۔ آپ کی ہے مگر سر بہ سر غلط
تنقید کا حضور یہ معیار ہی نہیں
سسٹم ہیں گم غلط ہے منسٹر ہیں سر غلط

قصائد

قصیدہ

رات جب نیند نہ کی مجھ کو مقدر نے الاٹ
نیند کیا۔ زیست سے جی ہوگیا بندے کا اچاٹ
کیا کہوں کیسی طبیعت کو ہوئی بیزاری
پھنس گئی ذہن کی بوتل میں جو افکار کی ڈاٹ
بستر و تکیہ و چادر پہ کفن کا تھا گماں
کھائے جاتی تھی تنِ زار کو ٹوٹی ہوئی کھاٹ
کھٹملوں کو جو خبر میری مصیبت کی ملی
نکلے چولوں سے جھلنگے کی دکھاتے ہوئے ٹھاٹ
ایسے عالم میں کبھی لب پہ دعائیں کبھی آہ
کبھی عہدے کی تمنّا تو کبھی مال کی چاٹ
کبھی یہ شوق کہ بن جاؤں منسٹر میں بھی
یا کسی ملک میں اعزازِ سفارت ہو الاٹ
کبھی تعریف وزیروں کی کبھی کلمۂ تلخ
رہنماؤں سے کبھی ربط کبھی بائیکاٹ
یہی حالت تھی کہ ناگاہ مجھے آگئی نیند
دیکھتا کیا ہوں کہ اک رشک پری حور کے ٹھاٹ

جلوہ گر ہے مری بالیں پہ بصد ناز و ادا
اور ہے غیرتِ اورنگِ سلیماں مری کھاٹ
مجھ سے کہتی ہے کہ کیوں ہے غمِ دوراں سے ملول
کیوں طبیعت ہے تری سارے زمانے سے اُچاٹ
مایۂ ناز کراچی کے لئے تیرا وجود!
گو کہ اِس شہر میں تو کوئی سکتر[1] ہے نہ لاٹ
فاتحِ کشورِ معنیٰ ہے تری تیغِ زباں
کس نے مانی نہیں اب تک تری تلوار کی کاٹ
دیکھ تو کرکے حکومت سے ریکوسٹ[2] کوئی
تو کہے گی مرے پیارے! نہ تری بات پہ ناٹ
NOT
NO
میں نے اُس حورِ پریزاد کی سن کر تقریر
عرض کی اس سے کہ لِلّٰہ مری بات نہ کاٹ
سُن تو لے حالِ پریشانیِ خاطر میرا
گوشِ خالی کو نہ یوں حرف و حکایات سے پاٹ
سُن کے بندے کے یہ الفاظ وہ بگڑی بے حد
مجھ سے کہنے لگی کم بخت تو شاعر ہے کہ جاٹ؟
دیکھ اِس طرح حکومت کی شکایات نہ کر
اپنے الفاظ کو واپس لے ابھی تھوک کے چاٹ

---

[1] پرانے زمانے میں سیکرٹری کو سکتر کہا جاتا تھا۔ [2] درخواست!

اٹھ کے لکھ اُس کی ستائش میں قصیدہ کوئی!
جس کی ہر بات میں ہیں قیصر و فغفور کے ٹھاٹ
میں نے پوچھا کہ وہ ہے کون؟ تو بولی پی ایم[1]
جو ہے ملّت کے سفینے کے لئے اَمن کا گھاٹ
میں نے اُس شاہد طنّاز کی فرمائش پر
رخشِ خامہ کو بڑھایا تو مِلی راہ سپاٹ
مدح میں خان لیاقت کی لکھا مطلعِ نو!
مُلہمِ غیب نے مضمون کیا تازہ الاٹ

مطلعِ ثانی

تو ہے وہ حاکمِ ذی مرتبہ اے لاٹوں کے لاٹ[2]!
ہیچ ہے جس کے مقابل میں اشوکا سمراٹ[3]
تو ہو گر رزم کے میداں میں صف آرا تو حریف
لاکھ رستم ہو مگر ہو تری آہٹ سے تراٹ[4]
ہے دعا تیرے لئے شام و سحر احقر کی
قائدِ قوم بڑھیں اور ترے شاہی ٹھاٹ
تیرا اقبال رہے تیرے وطن میں قائم
اور یہ قوم نہ ہو تیری قیادت سے اچاٹ

[1] پرائم منسٹر [2] لارڈ کو لاٹ کہا جاتا تھا [3] سمراٹ۔ شہنشاہ [4] تراٹ۔ ہیبت سے بھاگ جانا فرار ہونا۔

قصیدہ

صُبح دم میں نے سُنی ہاتفِ غیبی کی یہ بانگ
ہے اگر مرد تو ہرجانہ اَڑا اپنی ٹانگ
طاقِ دانش پہ کھلونے نہ خرافات کے دھر
دل کی کھونٹی پہ غمِ دہر کے پنجرے کو نہ ٹانگ
ہاتھ پھیلا نہ خدایانِ زمانہ کے حضور
بات "چوٹی" کی بتاتا ہوں کہ اللہ سے مانگ
وہ جواں مرد کہ ہوتا ہے بیگانہ رَوِ شوق
اُس سے رہتے ہیں غم و حُزن ہزاروں فرلانگ
مال دنیا کی تمنا میں یہ دنگہ یہ فساد
جب کہ خود قیمت دنیا ہے بقدرِ یک دانگ[1]
کام نکلا ہے کبھی اہل سیاست سے کوئی
ماوزی تون[2] و ستالین و خروشیف و چیانگ
ان کے اعلان ہیں اے دوست! فقط چیخ و پکار
ان کے پیغام ہیں اے یار! فقط اوٹ پٹانگ
جلوۂ شاہد ایّام پہ اِس طرح نہ رِیجھ!
روپ ہیں اس کے کئی اور کئی رنگ کے سانگ[3]

---

[1] دانگ۔ کوڑی [2] ماؤزی تون اور چیانگ چینی رہنما۔ استالین وخروشیف (روسی رہنما) [3] سانگ۔ سونگ۔

مانگ پٹّی سے ہے ہر چند یہ عیّار درست
وادیٔ موت کی پٹّی ہے مگر اِس کی مانگ
دونوں ہاتھ اپنے یونہی حرصِ زمانہ سے اٹھا
مُرغ جس طرح اٹھا لیتا ہے اپنی اک ٹانگ
عہدۂ و رتبہ و منصب کی تگ و دو بیکار
ملنگے تانگے کی ہے یہ چیز اِسے مانگ نہ تانگ
ایک ہی نسل کے افراد ہیں سلطان و گدا
ایک ہی کان کی مخلوق ہیں سیسہ ہو کہ رانگ
ایک ہی وضع پہ دیکھا ہے بشر کو ہم نے
سندھ و پنجاب سے تا ارضِ بہار و شیلانگ[1]
رنج و محنت کا تحمّل کوئی دشوار نہیں
شرط اتنی ہے کہ انساں ہو طلسمی کن کانگ[2]
کرب و زحمت ہو کہ آسائش و راحت! یکساں
فرق یک جَو ہے نہ تفریق ہے اُن میں یک دانگ
ساعتِ عید ہو یا عالمِ محرومیٔ عید
دونوں یہ راہ کے پتّھر ہیں تو دونوں کو پھلانگ
عید آئے بھی تو کیا اور نہ آئے بھی تو کیا
بھاگ اِس مکر کے چکّر سے کئی سو فرلانگ

---

[1] شیلانگ (آسام) [2] کِن کانگ (داستانی طلسمی پہلوان)

جشنِ عشرت کی تمنّاؤں پہ جی سکتا ہے!
صرف وہ شخص کہ ابلیس کا ہو ایڈی کانگ
مجھ کو کیا عیدِ مسرّت کی مسرّت ہو رئیس
میرے دل میں نہ خوشی کی ہے نہ غم کی کوئی مانگ
پہلے سے منزلِ راحت میں ہے لولا[1] مرا پاؤں
پہلے سے جادۂ عشرت میں ہے لنگڑی مری ٹانگ
دلِ محروم! غم و عیش کے دوراہے پر
پاؤں گاڑ اور لگا شوق سے مردانہ چھلانگ
مرد وہ ہے کہ غم و عیش کی پروا نہ کرے
یہ غم و عیش کی باتیں ہیں میاں! اُوٹ پٹانگ
یہ جہاں ہے ابدی و ازلی ویرانہ!
نہ یہاں غم کی طلب ہے نہ مسرّت کی ہے مانگ
اِس جہانِ ازلی و ابدی کا اے دوست!
ہے فقط ایک ہی روپ ایک ہی بھیس ایک ہی سانگ
مختصر یہ کہ ہمیں عید سے کچھ ربط نہیں
ہم سے یہ لے کوئی دمڑی[2] نہ ہمیں دے اِک دانگ

---

[1] لولا لنگڑا [2] دمڑی اور دانگ بہت چھوٹے سکّے۔

قصیدہ

گو کہ افکار و مشاغل کی کوئی حد ہے نہ اَنت[1]
پھر بھی ہیں کل صفِ احباب میں بیٹھا تھا نچنت

تذکرہ تھا چمنِ دہر کی نیرنگی کا
کہ یہاں شام کو پت جھڑ تو دمِ صبح بسنت

غیر ممکن کہ رہے وضعِ جہاں سے آزاد
وہ کوئی صوفی و درویش ہو یا سادھو سنت

محو ہوجاتے ہیں انساں کے نوشتے کیسے؟
اور کس درجہ اٹل کاتبِ قسمت کی لکھنت

کس کو معلوم یہاں اِس دلِ بسمل کی تڑپ
کون سمجھے گا بھلا طائرِ جاں کی پھڑکنت

چت ہوئے بازیٔ افلاک سے اِس دنگل میں
وہ گرانڈیل کہ رستم کو سکھاتے تھے لڑنت

مونہہ چھپاتے ہیں اِسی کھیت میں آکر جیوٹ[2]
جی چراتے ہیں اِسی رن میں اتر کر ساونت

سرنوشت اپنی غلط ہو تو نہیں کام آتا
کسی مرشد کا وظیفہ کسی پنڈت کی پڑھنت[3]

---

[1] انت۔ اختتام [2] جیوٹ جیالے [3] پڑھنت یعنی پڑھائی۔

لذتِ گم رہیٔ جہل سے آگاہ نہیں!
علم کی بزم میں جو لوگ کہ بیٹھے ہیں نچنت
یا وہ گوئی ہے کسی بات کا کہنا سُننا
یا وہ گویوں کا طریقہ ہے کہنت اور سُننت[1]
دامِ ہستی سے اسیرانِ بلا کی پرواز
جیسے پنجرے سے کسی بالِ شکستہ کی اُڑنت
مذہب و فلسفہ و منطق و تاریخ و کلام
کچھ نہیں گم رہیٔ محض ہے یعنی بھٹکنت
فلسفہ کیا ہے؟ بجز معرکۂ صدق و دروغ
رہی تاریخ تو کچھ اصل ہے اور کچھ ہے گھڑنت
بارشِ علم و حقائق جسے کہتا ہے جہاں
ریزشِ مغز ہے یعنی کہ دماغی ٹپکنت
طبعِ آزاد ہو کیا مطمئنِ مرگ و حیات
زندہ رہنا ہے کٹھن جاں سے گذرنا ہے کٹھنت
حرمِ رازِ حقیقت سے ہیں اب تک محروم
ہوں کسی زاویۂ کے شیخ کہ مندر کے مہنت
کوئی کہتا ہے کہ دورِ شفا گردی ہے
کوئی ہے کہ وہ وقت ہے جس کو کہیں تنت[2]

---

[1] یہ تمام قافیے وضعی یعنی بنائے گئے ہیں [2] تنت کا وقت۔ یعنی نازک وقت۔

الغرض شکوۂ آفاق میں ہم تھے مصروف
قابل دید تھی شہبازِ تخیل کی اُڑنت !
ناگہاں شیخ زٹلی کی یہ آواز آئی
تم پہ پھٹکار مسلسل ہو تو نفریں بے اَنت
کھول کر چونچ نئی رُت کے ترانے گاؤ
سال بھر بعد پھر اس باغ میں آئی ہے بسنت
شیخ و واعظ سے یہ کہدو کہ خدارا خاموش
ورنہ ریش تو بہ پکڑ ندو جھڑا جھڑ جھٹکنت
غافلو! تم کو خبر ہے کہ بڑا دن آیا
ایک بڑے شخص سے ہے جس کو میسر یہ بڑنت
نسبتِ عیسیٰ مریم پہ کلیسا کو ہے ناز
اور یہ رُت ہمیں پیدائش قائد سے بسنت
روزِ پیدائشِ قائد ہے یہی روز سعید
ہمدمی یہ ہے کہ ہم لوگ دم اس دن کا بھرنت[1]
یہ کرسمس ہے بڑا دن بھی جنم دن بھی یہی
واقعہ یہ ہے کہ دو کاج ہیں اور ایک ہے پنت[2]

---

[1] دم بھرنا [2] پنت (دو کاج ایک پنتھ ضرب المثل ہے)

قائدِ قوم کی تعریف میں لکھ مطلعِ نو
محفلِ شعر میں کام آئے گی اے دل! یہ (لکھ بعد ثبت)

مطلع ثانی

تو ہے اے قائداعظم وہ سیاسی ساونت
کر سکے جس سے نہ افرنگ کے رستم بھی لڑنت
تیرے جوہر سے پریشان جواہر سا جری
سخت حیراں ترے اسرار سے گاندھی سا سَنت
جُھک گئے قائداعظم تری عظمت کے حضور
آریہ وَرت کے مندر کے مہا ویر مہنت
یعنی راجندر و گوپال و پٹیل و نہرو
گاندھی و مالویہ - مہتہ و پرشوتم و پنت[1]
اَن گنت ہیں ترے اوصافِ حمیدہ واللہ
تیرے اطوار گرامی کی نہیں کوئی گنت
مختصر یہ ہے کہ اے قائداعظم ترے بعد
قوم اُسی راہ میں ہے جس کا نتیجہ بھٹکنت
ختم کر شکوۂ ارباب زمانہ کو رئیسؔ
ورنہ تجھ پر کہیں کم بخت طمانچے نہ پڑنت

---

[1] یہ سب کانگرس کے اعلےٰ ترین لیڈروں کے نام ہیں۔

قصیدہ

عشقِ افرنگ ہے یوں ہر عملِ خیر کی جڑ
نسخۂ ہضم کی جس طرح کہ بنیاد ہے ہڑ
شدتِ سیلِ حوادث ہو تو اے یارِ عزیز!
دامنِ دولتِ امریکہ و یورپ کو پکڑ
یہ خدایانِ فرنگی ہیں خدا کا سایہ!
ان خدایانِ فرنگی سے خدارا نہ اکڑ
ہیں نظر کردۂ الطافِ الٰہی۔ یہی لوگ
ان کی چوکھٹ پہ جبینِ ادب و عجز رگڑ!
ایشیا والوں کو یورپ کے مقابل یہ گھمنڈ
کوہ کے سامنے ذرّے کی اکڑ اور تکڑ
ان کو اللہ نے اوصاف نئے بخشے ہیں
کہیں سختی میں ہیں لوہا کہیں نرمی میں رَبڑ
باغِ عالم میں رَوش اِن کی نہ سمجھا کوئی
یہ کبھی رُت ہیں بسنتی تو کبھی ہیں پت جھڑ
جس طرف جائیے مغرب نے بچھائی ہے بساط
جس طرف دیکھئے یورپ نے بچھائی ہے پھڑ[1]

---

[1] یارانِ زندہ دل کے جمع ہونے کی جگہ۔

تین سو سال سے ہیں حاکم تقدیر یہی
اِن سے کیا لڑتا ہے؟ تقدیر سے لڑنا ہو تو لڑ

یہ جہاں عرصۂ عالم میں قدم رکھتے ہیں!
وہیں مچ جاتی ہے اقبال سے اِن کے گڑبڑ

عقل و سائنس پہ ہے اِن کی ترقی کی اساس
برق اور بھاپ میں ہے اِن کی فتوحات کی جڑ

سارا عالم ہے گرفتار۔ وہ اِن کی ہے گرفت
ساری دنیا ہے جکڑ بند وہ اِنکی ہے پکڑ

گوری قوموں میں بھی کیا قوم ہے امریکی قوم
سربلند اور سرافراز سڈول اور سگھڑ

رِیس کرنا ہے کسی کی تو کر اِس ملک کی ریس[1]
پیچھے پڑنا ہے کسی کے تو اِسی قوم کے پڑ

فکر نوخیز! کہاں تک یہ مضامین کہن
مطلع تازہ کوئی نظم کے صفحے میں جکڑ

---

[1] ریس۔ تقلید

مطلعِ ثانی

سر سلامت ہے تو ملتی ہے کہیں جسم کی جڑ؟
جسمِ گیتی میں سَر امریکہ ہے ہم لوگ ہیں دھڑ
بخت لایا ہے تجھے حاتمِ مغرب کے حضور
دستِ سائل نہ بہک دامنِ حسرت نہ سکڑ
گو کہ ڈالر کے خزینے ہیں لبا لب لیکن
فیض اٹھاتا ہے وہی شخص کہ ہو لَم پچڑ[1]
آستانہ اِسی دولت کا ہے ملجائے عوام!
اس زمانے میں کہ ہر سو ہے پکڑ اور دھکڑ
اللہ اللہ بہارِ چمنِ واشنگٹن!!
جس میں چلتے ہی نہیں بادِ خزاں کے جھکڑ
نسبت امریکۂ اعظم سے زمانے کو کہاں؟
وہ ہے کم خواب و حریر اور زمانہ گودڑ
اُس کے خدّام کی قسمت میں اُلوہی انعام
اُس کے بدخواہ کی تقدیر میں غیبی تھپڑ
دستِ شفقت مرے سر پہ ہے جو امریکہ کا
خوف پھر کیا ہے جو دنیا میں مچی ہے گڑبڑ

---

[1] لم پچڑ کے معنی ہیں ضدی سائل یا چمٹ جانے والا حاجت مند۔

ورقِ دہر اُلٹنے کی جو طاقت ہو اُلٹ
بختِ برگشتہ! بگڑنے کی جو ہمّت ہو بگڑ
ہم کہاں اور یہ مغرب کے خداوند کہاں؟
فرق ہے مشرق و مغرب کا سمجھ اَو ہیکڑ[1]
ہم ہیں بالشتیے انسان تو امریکہ دیو
ہم ہیں ناچیز سے تنکے تو فرنگی لکڑ[2]
ریزہ ریزہ کیا ایٹم کو انہی لوگوں نے
اور ہم سہہ نہ سکے ایک بھی ذرّے کی رگڑ
وہ فلک پر ہیں زمیں پر ہم اَڑے بیٹھے ہیں
اُن کا پیغام ہے اُڑ اور یہاں کام ہے اَڑ[3]
راہِ امریکہ و یورپ ہے عجب راہ نجات
گو کہ اِس راہ میں حائل ہے سیاسی کیچڑ
ختم کر اپنے قصیدے کو دعا پر للّٰہ
اے قلم! طولِ سخن پر تو خدارا نہ اکڑ
کوچ امریکہ کی جانب ہو ۔ ہمارا اے کاش
باندھ کر سر سے کفن ہاتھ میں لے کر اِک چھڑ

[1] ہیکڑ ۔ ضدی [2] لکڑ ۔ بڑی لکڑی [3] اَڑ ۔ کسی بات پر اڑ جانا ۔

قصیدہ

بلائے فقر۔ بلا سے جہاں میں ہو تنگڑی
کریں گے ہم نہ کسی کے حضور کَن[۱] پکڑی

دکھائی لاکھ فلک نے اکڑ تکڑ لیکن
ہمیشہ گردنِ اہلِ عمل رہی اکڑی

خوشا یہ جشن یہ جمہوریّت[۲] کی سالگرہ
خوشا کہ دل میں امیدوں نے پھر جگہ پکڑی

ہر انقلاب ہر اک کشمکش کو جھیل گئی
مرے وطن میں ہے جمہوریت بہت تگڑی

بنایا ۔ ہم نے تصوّر کے "تانے بانے سے
دیارِ پاک کا گھر بن کے عزم کی مکڑی

وہ قوم آج ہے آزاد و خود فروز کہ تھی
فساد و ظلم کی زنجیرِ سخت میں جکڑی

ہمیں نہ سندھی و پنجابی و بلوچ میں بانٹ
کہ ایسی باتوں سے چلتی ہے قوم میں لکڑی

ہمیشہ وحدتِ ملّی رہے تجھے ملحوظ
اسی پہ اکڑی ہے یہ قوم جب کبھی اکڑی

۱؎ کان پکڑ کر اٹھک بیٹھک کرنا ۲؎ جمہوریت تشدید سے ہے۔ لیکن عام بول چال میں جمہوریت کو تشدید کے بغیر بولا جاتا ہے۔

اٹک سکے گا کسی جا نہ قوم کا چھکڑا
جو راستے ہیں نہ ہو اختلاف کی چھکڑی[1]

جو تار و پود رہیں ملک و قوم کے مربوط
بُنے گی جال ترقی کے بخت کی مکڑی

کہیں گے اہلِ زمانہ سے بیچ کھیت کے ہم
ہم آدمی ہیں نہ سمجھو ہمیں کدّو ککڑی

پکڑ لیا اُسے عبرت نے آ کے آخر کار
وہ قوم جس نے نہ عبرت جہاں میں خود پکڑی

ہزار خامیٔ تدبیر دل شکن ہو مگر
دیارِ پاک کی تقدیر ہے بہت تکڑی

پکڑ دھکڑ سے نہ ڈر تو کہ روحِ حریّت
کسی نے دھر میں پکڑی نہ آج تک دھکڑی

بنائے جاؤں گا بے شک میں قافیہ اُس کو
لگائے جائیں ہر اک لفظ میں وہ بے شک۔ ڑی

رئیں ختم قصیدے کو کر دعاؤں پر
دعا بھی وہ کہ جو تیکھی بہت بہت تکڑی

عطا ہو شاخِ گلِ تازہ خیر خواہوں کو
نصیبِ دشمنِ ملّت جلی ہوئی لکڑی

---

[1] یہ لفظ ایجاد بندہ ہیں۔ چھکڑی۔ دھکڑی

قصیدہ

ہے کراچی میں ہر اک طرزِ عمل کی مکھی
زہرِ موسم کی سیاست کی عَسل کی مکھی
کیا قیامت ہے کہ اس شہر وبا پرور میں
حملہ آور ہوئی ہر دشت و جبل کی مکھی
ذکر کیا ٹھٹھہ و جھمپیر کا اِس بستی میں
اُڑکے آ پہونچی ہے کوہاٹ کی تھل کی مکھی
آج کل عام ہے لوگوں پہ وبا کا حملہ
ور سالار ہے اِس جنگ و جدل کی مکھی
بِللہ الحمد کراچی میں نظر آتی ہے
ہر قماش و روش و وضع و محل کی مکھی
مکھیوں کا ہو چمن زار عجائب تیّار
جمع کی جائے جو ہر پھول کی پھل کی مکھی
چشمِ بد دور یہ شہزوری و صحت ان کی
پشّہ بن جاتی ہے اک آن میں کل کی مکھی
کیوں کراچی میں نہ ہو کثرتِ افواجِ مگس
کہ سمٹ آئی ہے ہر قوم و ملل کی مکھی

قدر اُن کی کوئی عشّاقِ مگس سے پوچھے
لاکھ سکّوں پہ گراں ایک ڈبل کی مکھّی

ایک ہی طنطنۂ فتح و ظفر سے سرشار
اہلِ عشرت کی کہ اربابِ دوں کی مکھّی

ایک ہی نشۂ اقدام و عمل سے مخمور
اہلِ غفلت کی کہ اربابِ عمل کی مکھّی

ایک ہی ڈنک ہے۔ کوچک کہ کلاں نر ہو مگس
ایک ہی شان ہے بھاری ہو کہ ہلکی مکھّی

للّٰہ الحمد کہ ہے دستِ رَس شاعر میں
وہ قصیدے کا ہو مچھر کہ غزل کی مکھّی

اب تو ہر لحظہ ہے اِس شہر پہ یلغارِ مگس
اب تو مہلت نہیں دیتی کسی پَل کی مکھّی

ہوگئی شعر کی معجونِ مرکّب تیار
ہم نے گُل قندِ معانی میں جو حَل کی مکھّی

پہلے آئینہ تھا اور جلوۂ صد رنگ بہار
اب یہ صورت ہے کہ آئینے میں جھلکی مکھّی

عالمی بزم سیاست میں ہزاروں کیڑے
مثلاً مجلس اقوام و مِلل کی مکھّی

مثلاً مشرقِ وسطیٰ کو ستانے کے لئے
وہ یہودی عربی جنگ و جدل کی مکھّی
واقعی شہر کراچی میں ہے فی الحال لے دوست
بانیٔ کار ہر اک ردّ و بدل کی مکھّی
ناظم آباد سے تا حدِّ ملیر و لانڈھی
بھنبھناتی ہے فسادات و خلل کی مکھّی
شیرہٴ عہدہٴ و منصب کی جو سونگھی خوشبو
رقص میں آگئی امّید و اُمل کی مکھّی
ہیں جو بد ذوقیٔ و بدگوئیٔ صفرا کے مریض
زہر لگتی ہے انہیں میری غزل کی مکھّی
مشتِ خاکی کو ہو کس بات پہ غرّہ آخر
ناک پر بیٹھی ہے انساں کے اجل کی مکھّی
مکھّیاں کیوں مری قسمت پہ بھنکتی ہیں رئیسؔ
کیا مرے بخت میں ہے برجِ حمَل کی مکھّی
للّٰہ الحمد کہ میں پشّہٴ اعجازِ سخن
اور اغیار ہیں جادو کے عمل کی مکھّی

قصیدہ

دل تھا کل شب۔ غمِ اردو سے نہایت تلپٹ
تھی مری زلفِ تخیل کی پریشاں ہر لٹ
سوچتا تھا کہ یہ اردو ہے وہ محسود زباں
دلِ اغیار سے نکلی نہ کبھی جس کی کپٹ
کبھی ہندی سے نپٹا۔ کبھی انگلش سے نزاع
الغرض اس کی حریفوں سے ہمیشہ کھٹ پٹ
کبھی سرکار مخالف تو کبھی غیر خلاف
راج ہٹ اسکے مقابل تو کبھی بالک ہٹ
اُس نے جیتی عمل وجہد و بقا کی ہر جنگ
اُس نے روکی سپہ غیر کی ہر چھین جھپٹ
دیکھنا یہ ہے کہ مستقبلِ اردو کیا ہے؟
ہے مقدّر کو اُلٹنا کہ مقدر کی اُلٹ
ناگہاں نیند نے آنکھوں کے دریچے بھیڑے
بند پلکیں ہوئیں افکار نے بدلی کروٹ
عالم خواب میں دیکھا کوئی سُندر دیوی
جلوہ گر ہے مرے آغوش میں کاڑھے گھونگٹ

سر سے پا تک کسی بُت گر کا تخیل جیسے
یا کسی شمع کی لَو یا کسی شعلے کی لپٹ
زلفِ آشفتہ کی وہ بکھری ہوئی رعنائی
پیکرِ ناز کی وہ نکھری ہوئی نرماہٹ
ہائے وہ ماتھے کی بندی وہ جبیں کا قشقہ
ہائے وہ عارضِ تاباں وہ معطّر ہر لٹ
ہائے زرکار وہ ساری کہ جھلا جھل قربان
ہائے رنگین وہ انگیا کہ دوپٹہ چوپٹ
مدھ بھری آنکھ سے پلکوں کا یکایک ہٹنا
جیسے کھل جائیں کسی میکدۂ راز کے پٹ
الغرض ایسی سُبک ایسی سجل ایسی سڈول
جس کو دیکھے تو پری لیلے بلائیں چٹ چٹ
عالمِ خواب میں وہ کافرۂ سحر طراز
مجھ سے بولی بصد انداز الٹ کر گھونگھٹ
تجھ کو معلوم ہے میں کون ہوں کیوں آئی ہوں
سُن مرا نام ہے بنگلہ۔ مری خو بالک ہٹ[1]

[1] اردو بنگلہ زبان کے تنازعے کے سلسلے میں۔

لوگ کہتے ہیں کہ اردو کا پرستار ہے تو
یہ اگر سچ ہے تو چل دور ہو احمق۔ چل ہٹ
تو مجھے دیکھ مرا روپ مری چھل بَل دیکھ
جیسی میں ہوں تری اردو بھی ہے ایسی نٹ کھٹ
تُرک و فارس کے تعلق پہ سدا ناز اُسے
آریہ دیس کی مٹّی پہ مری اِتراہٹ
عربی ہے اُسے پیاری تو مجھے سَنسکِرت
اُس کو قرآن کا ہے ورد مجھے وید کی رَٹ
غالب و حالی و اقبال جلو میں اُس کی
بوس و ٹیگور و مکرجی مری کروٹ کروٹ
اب میں لاہور و کراچی میں بسوں گی آکر
گو ہیں موجود مرے واسطے ڈھاکہ سلہٹ
سُن کے بنگلہ کی یہ تقریر مرا دل دھڑکا
وہ بھی اِس طرح کہ دہشت سے گئی آنکھ اُچٹ
ناگہاں کان میں ہاتف کی یہ آواز آئی
مرگِ اردو سے ہوئی محفل ملّت تلپٹ
آرزو یہ ہے کہ قائم رہے بنگلہ کا سہاگ
اور اردو کے لئے خلد ہو کروٹ کروٹ

قصیدہ

رشتۂ شوق میں اے دستِ طلب ڈال گرہ
آٹھویں ملّت آزاد کی ہے سال گرہ

ہے ہر اِک لمحۂ آزادیٔ ملّت جاوید
از ازل تا بہ ابد ہے فقط اِک سال گرہ

للّٰہ الحمد یہ صبحِ ازلِ استقلال!
للّٰہ الشکر یہ شامِ ابدِ سال گرہ

زلفِ حرّیتِ ملّی کے مبارک خم و پیچ
جس کے ہر پیچ میں ہو عظمت و اقبال گرہ

بال و پر آج اُسی طائرِ سدرہ کے کھلے
جس کا ہر پَر تھا گرہ بند۔ تو ہر بال گرہ

لب کُشا آج وہ ملّت ہے بصد خوش گوئی
جس کی گفتار میں پڑتی تھی بہر فال۔ گرہ

کھُل گئیں رشتۂ امید و طلب کی گرہیں
اے دل! اب کام ہیں اپنے نہ کوئی ڈال گرہ

سُبحہ گردانِ حوادث سے یہ کہہ دے کوئی
رشتۂ جہد میں پڑتی نہیں فی الحال گرہ

اُف وہ محکومیٔ اغیار کے ظالم خم و پیچ
آہ وہ عہدِ غلامی کی زبوں فال گرہ
اَب کوئی گیسوئے ظلمت کا بکھرنا دیکھے
دستِ اقبال نے کھولی بصد اجلال گرہ
اب کوئی کاکلِ ملّت کا سنورنا دیکھے
شاہدِ عزم نے باندھی بصد اقبال گرہ
کیا مبارک ہیں یہ شام و سحرِ استقلال
کتنے مسعود ہیں یہ روز و شب اے سال گرہ
عُقدۂ قلبِ گرفتہ جو ہوا وا تو رئیس
کیوں زباں میں ہو دمِ پرسشِ احوال گرہ
اب مرے کام میں صرف ایک گرہ ہے باقی
اور وہ گیسوئے جاناں کی جواں سال گرہ
رشتۂ نظم میں ڈال ایک حسیں مطلع سے
طبعِ وقّاد! کوئی اور نکو فال گرہ

مطلع ثانی

رشتۂ عشقِ وطن کی ہے جواں سال گرہ
ہشتمیں سال گرہ سال گرہ سال گرہ
لیکن اے قوم! نہ اِس سال گرہ سے خوش ہو
گرہِ سال سہی۔ ہے تو بہر حال گرہ
اب کہاں تیری وہ تقدیر کہ آکر کھولیں
قائدِ اعظم و علامۂ اقبال گرہ
کیا غضب ہے کہ نہ ہو عقدہ کُشائے جمہور
جشنِ آزادیِ ملّت کی نئی سال گرہ
کیا ستم ہے کہ ہو یارانِ وطن کو یہ وہم
سالِ ہشتم کی گرہ۔ جی کی ہے جنجال گرہ
واقعہ یہ ہے کہ گر خاطرِ عاشق نہ ہو وا
زلفِ محبوب کا بن جاتا ہے ہر بال گرہ
رہ نمایانِ گرہ باز کا عالم یہ ہے
ان کے افکار ہیں پیچیدہ تو اقوال گرہ
یوں بٹاتے ہیں بہر گام یہ خود کو جیسے
کھائیں پروازمیں مُرغانِ سبک بال۔ گرہ

وطنِ نو پہ مسلّط ہیں یہ افراد ایسے
مصرعِ تازہ کی ہو جیسے کہ پامال گرہ[1]
رشتۂ قوم و وطن میں ہیں ہمارے زعماء
ایک فرسودۂ دکم زور و زبوں حال۔ گرہ
اِن سے دشوار عزیبوں کی کشودِ خاطر
جن کے اندر ہو تمنائے زر و مال گرہ
اتنے پیچیدہ مسائل ہیں ہمارے کہ رئیسؔ
کام میں پڑتی ہے اپنے بہر احوال گرہ
نہ تصور میں ہے وسعت نہ تخیّل میں کُشاد
عقدۂ فکر گرہ۔ بندشِ اقوال گرہ!
سببِ عقدۂ خاطر ہے یہ پیچیدہ ردیف
سچ تو یہ ہے کہ مرے جی کی ہے جنجال گرہ
ختم کر سلسلۂ قافیہ بندی کو رئیسؔ
رشتۂ شعر میں تازہ نہ کوئی ڈال گرہ

---

[1] مصرعِ طرح پر جو مصرع لگایا جاتا ہے اُسے گرہ کہتے ہیں۔

قصیدہ عید قرباں

ذبح کر دے نہ اسے دوست! پکڑ کر کوئی آڑ
بندہ۔ قرباں تری عید کے دنبہ نہ پچھاڑ
گوسفندوں کا ذبیحہ ہے بہت خوب مگر
اِس سے ہو جاتے ہیں چرواہوں کے دیہات اُجاڑ
تو نے سمجھا ہی نہیں فلسفۂ قربانی
نفسِ سرکش پہ چھری پھیر اُسے خاک میں گاڑ
منزلِ عزمِ خلیلی سے تجھے کیا نسبت؟
ہر قدم راہِ وفا کا تری نظر[illegible]ن پہاڑ
ان کے نعروں سے دلِ کوہ میں پڑتا تھا شگاف
تیرے دل میں سخنِ تیز سے پڑتی ہے دراڑ
تجھ کو اے دوست! ذبیحے کی تمنا ہے تو پھر
شوقِ قربانی و ایثار کا حلیہ نہ بگاڑ
عیدِ قرباں کے جو اسرارِ خفی ہیں تجھ پر
ہیچ کر جہل کی آنکھوں کو نظر اُن پہ گاڑ
یعنی اِک مقصدِ اعلےٰ کے لئے قربانی
لاکھ اِس جرأت بے جا سے پڑے تجھ پہ لتاڑ

تو یہ کرتا ہے کہ اِس فرض سے ہوکر غافل
ہاتھ میں لے کے چھُری خاک پہ بکرے کو پچھاڑ
تو سمجھتا ہے کہ تکمیل۔ مقاصد کی ہوئی
میں سمجھتا ہوں یہ اخفائے حقیقت کی ہے آڑ
جی میں آتا ہے لِکھوں مطلعِ ثانی ایسا
جس کو پڑھتے ہی ہر اک شخص گریباں دے پھاڑ

مطلعِ ثانی

ساقیا! عید ہے پی اور پلا مونہہ نہ بگاڑ
میری خاطر سے بطِ مے کو سرِ بزم پچھاڑ
چھُوے ہر کنگرۂ گنبدِ مینائی کو
باندھ کر شعر کی دیوار پہ تخیّل کی پاڑ
یہ کراچی ہے حقیقت میں عجب قرباں گاہ
دیکھ اِس شہر کے حالات نظر غور سے گاڑ
ذبح ہوتے ہیں یہاں خنجرِ غم سے وہ لوگ
جن کو اللہ نے بخشے ہیں بہت چکلے ہاڑ

لے ہاڑ۔ یعنی قد و قامت

گوسفندانِ بلاکش ہیں یہاں کے شہری
ٹوٹتے جن پہ ہیں آلام و مصائب کے پہاڑ

جتنے دانا ہیں وہ دانوں کے لیے پستے ہیں
شہر ہے آگ کی بھٹی کہ بھڑکتا ہوا بھاڑ

دستِ افلاس سے گھس گھس کے ہوئے ہیں پستہ
جو تن و توش میں ہاتھی تھے تو قامت میں تاڑ

تان دیتے تھے جو طوفان کے آگے سینہ
اُن کے سینوں میں پڑی ضربِ حوادث سے دراڑ

ایسے عالم میں تجھے فکرِ ذبیحہ ساقی!
سیرِ بسمل ہے جو منظور تو اپنے کو پچھاڑ

ہم تو مٹتے چلے آتے ہیں کوئی بات نہیں
جب بھی بستے ہیں تو دنیا ہمیں دیتی ہے اجاڑ

ختم کر "ڑ" کے قصیدے کو خدارا مرزا[1]
کیوں بڑھاتا ہے بھلا اپنے رفیقوں سے توراڑ[2]

رنگِ ایّام بدل جاتا ہے دم بھر میں رئیس
ایک ہم ہیں کہ مقدّر میں بناؤ نہ بگاڑ

---

[1] یہ قصائد پہلے مرزا کے فرضی نام سے شائع کیے جاتے تھے۔ [2] راڑ۔ جھگڑا۔

قصیدۂ میلادِ قائدِ اعظم

دل کو منظور نہ ہوتی جو کسی شخص سے چھیڑ
بخدا ہم تو اکھاڑتے نہ محبّت کی کھکھیڑ
جل رہا ہوں شجرِ عشق کی شادابی سے
کاش پھلتا نہ مرے مزرعۂ ہستی میں یہ پیڑ
جوشِ وحشت کی ضدیں وہ کہ عیاذ باللہ
کبھی یہ حکم کہ بُن اور کبھی ضد کہ اُدھیڑ
کام تدبیر کا یہ ہے کہ اُکھیڑ اور پچھاڑ
حکم تقدیر کا یہ ہے کہ پچھاڑ اور اُدھیڑ
منزلِ امن کہاں مرحلۂ ہستی میں
کہ بہر گام حوادث سے یہاں ہے مڈبھیڑ
پھر بھی آلام کے در لے دلِ گستاخ! نہ کھول
پھر بھی کوشش کے کواڑ اے غمِ بے باک! نہ بھیڑ
رندِ آوارہ سے کہہ دو کہ بس اپنے سے نمٹ
زاہدِ خشک سے کہہ دو کہ فقط اپنی نبیڑ[1]
کیا ہوا ساتھ جو اپنے ہیں غموں کی افواج
کیا ہوا پاس جو اپنے ہے دکھوں کی اک بھیڑ[2]

---

[1] تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تو [2] مجمع۔ ہجوم

ہے وہی مرد کہ جو کھم[1] میں جو خود کو ڈالے
ہے وہی مرد کہ خود بڑھ کے اٹھائے جو کھیڑ[2]

مرد باطن میں جو فولاد تو ظاہر میں حریر
مرد فطرت میں جو ضرغام تو انداز میں بھیڑ

مرد پنہاں ہو تو سیلاب۔ نمایاں ہو تو دشت
مرد چلنے میں جو آندھی تو برتنے میں ہو پیڑ

مرد جو قائداعظم کی طرح بڑھ کے کرے
ایسے ویسے سے نہیں گردش ایام سے چھیڑ

چھڑ گیا آج پھر اک مرد گراں مایہ کا ذکر
دل گستاخ سمٹ زانوئے آداب سکیڑ

آگیا لب پہ یہ کس فرد جواں مرد کا نام
غم ایام! نبڑ[3]۔ شکوۂ ایام نبیڑ

لکھ پھر اُس کے مناقب میں کوئی مطلع تو
اِس قصیدے میں غم دہر کا مضموں نہ گھسیڑ

---

[1] جوکھم: مشکل [2] کھاکھیڑ: جھگڑا [3] نبڑ: ختم ہونا۔

مطلعِ ثانی

تو نہیں قائدِ اعظم تو نہ بُن ہے نہ اُدھیڑ
پڑ گئی اور بھی ملّت کے بکھیڑوں میں بکھیڑ
تو نے جس پیڑ کو سینچا تھا لہو سے اپنے
آج ہے صرصرِ ایام کی زد میں وہی پیڑ
واقعی یہ ہے ۔ قیادت کا حقیقی اعجاز
نوجواں ہو گئی دم بھر میں جو ملّت تھی اُدھیڑ
یومِ پیدائشِ قائد ہے وہ تاریخِ سعید
چھاؤں میں جس کی اُگا عظمتِ تاریخ کا پیڑ
ختم کر اپنے قصیدے کو دعاؤں پہ رئیسؔ
اپنے اُلجھے ہوئے حالات کو تو آپ نبیڑ
یا رب! اِس قوم کے اقبال کی بنیاد جما
دستِ قدرت سے جڑیں قوم کے اعدا کی اُکھیڑ

قصیدۂ عیدِ قرباں

عشق پر وا ہیں رموزِ ازلی کے پھاٹک
عقل کی راہ میں حائل کئی دریائے اٹک

عشق نے ڈھونڈھ نکالا دُرِ مقصودِ حیات
عقل اوہام کی کرتی ہی رہی چھان پھٹک

عقلِ کاذب کبھی سمجھے گی نہ سمجھی ہے اُسے
عشقِ صادق میں جو ہے ترکِ تمنّا کی لٹک[1]

عقلِ باطل کی چمک اور دمک پر قربان
عشق کے پاس حقائق کی چٹک اور مٹک

مدعی راہ نمائی کی ہے بھٹکی ہوئی عقل
عشق کا ہے یہ تقاضا کہ ابھی اور بھٹک

عقل کا حال ازل سے ہے کہ ٹک ٹک دیدم
عشق کرتا ہے درِ دوست پہ جا کر ٹک ٹک

عقل جب دامنِ تدبیر میں لیتی ہے پناہ
عشق تدبیر سے کہتا ہے کہ دامن کو جھٹک

نشۂ بادۂ غفلت ۔ سرِ عاقل کا خمار
خلشِ سینۂ فطرت دلِ عاشق کی کھٹک

---

[1] لٹک ۔ رجحان ۔ میلان یا ادا۔

عالم انفس و آفاق ہے جولاں گہ عشق
عقل کی حدِّ نظر شام و سحر کا ناٹک

شورِ مرغانِ سحر گوشِ خرد کو محبوب
بار ہے سامعۂ عشق پہ غنچے کی چٹک

عقل ناداں کا اشارا طرفِ دار۔ نہ جا
عشق داناں کہ تقاضا کہ سرِ دار۔ لٹک

عشق کہتا ہے کہ گھمسان ہیں وڑانہ در آ
عقل کہتی ہے کہ خطرے سے گھسٹ بلکہ سٹک[1]

عقل کہتی ہے کہ نزدیکِ غمِ عشق نہ جا
عشق کہتا ہے کہ پاس اہل خرد کے نہ پھٹک

عقل کی ندرتِ ایجاد تھا جام جمشید
عشق کہتا ہے کہ اِس جام کو پتھر پہ پٹک

عشق خود ناچ نچاتا ہے مہ و پرویں کو
عقلِ رقاص! مٹکنا ہے تو اپنے پہ مٹک

عشق اور عقل میں کچھ ربط اگر ہے تو یہی
عقل کھٹکا ہے دماغوں کا دلوں کی یہ کھٹک

عشق اور عزمِ براہیمی و ایثارِ ذبیح!
عقل اور قیصر و نمرود کی شاہانہ لٹک[2]

---

[1] چپکے سے نکل لینا۔ [2] لٹک یعنی ادا۔

عیدِ قرباں ہے فقط مظہرِ قربانیٔ عشق
تو فقط جشنِ مسرّت کی حدوں پر نہ اٹک
عالمِ شوق میں لکھ مطلعِ ثانی ایسا
جس سے کُھل جائیں معانی کے طلسمی پھاٹک

مطلعِ ثانی

کچھ نہیں عالمِ ظاہر کی چمک اور دمک
کھول دے عشق اگر جذبِ دروں کے پھاٹک
عیدِ قرباں کا نہیں اس کے علاوہ پیغام
موت ہے معرکۂ زیست میں دم بھر کی ٹھٹک[1]
تیرا مقصود ہے گر رسم و رہِ اسمٰعیل
منزلِ عشقِ خلیلی میں ذرا اور بھٹک
ہو نہ گر جلوۂ ایمان و یقیں پیشِ نگاہ
زندگی کیا ہے فقط وہم و گماں کا ناٹک
آدمی جنّتِ ارضی پہ مسلط ہے تو کیا
بند ہیں آج بھی خلدِ ابدی کے پھاٹک
یوں نہ ٹِک[2] ہمّت و اقدام کی آواز پہ دوڑ
سُن نہ گھڑیال کی ٹن ٹن نہ گھڑی کی ٹک ٹک

---

[1] محاورہ ہے ٹھٹک کر رہ گئے۔ [2] ٹِکنا۔ ٹھہر جانا۔ قیام کرنا۔

جشنِ عشرت ہے رئیس آج تو آنسو نہ بہا
عید آئی ہے رئیس آج تو سر کو نہ پٹک

درسِ ایثار ہے عالم کو یہ عید الاضحیٰ!
تو بھی کچھ چھیچ[1] ذرا تو بھی تو کچھ آج جھٹک

جہد و ایثار و فدا کاری و قربانی و عزم
یہی جوہر ہیں گئے جن سے فرشتے بھی ٹھٹک

گلشنِ دہر ہے خونِ شہدا سے شاداب
ورنہ کیا رکھا ہے گلزار میں؟ کانٹوں کی کھٹک؟

گل کو سرمایۂ صد جشن ہے شبنم کی اجل
پھول کو نغمۂ تخلیق ہے غنچے کی چٹک

عیدِ قرباں یہی پیغام ہمیں دیتی ہے
سر تسلیم جھکا۔ حربۂ تدبیر پٹک

ختم کر اپنے قصیدے کو دعاؤں پہ رئیس
کھولتے ہیں اسی کنجی سے فلک کے پھاٹک

یارب! اِس قوم کو وہ جذبۂ و جوہر ہو عطا
جس میں شاہی کی ادا ہو تو فقیری کی لٹک

غزنوی ہو اگر اِس قوم کا ہر پیر و جواں
ہم میں ہر شاعر و فن کار ہو خوشحال خٹک

---

[1] چھیچنا یعنی بادل ناخواستہ خرچ کرنا۔ جھٹک زبردستی مال نکالنا۔ زبردستی کا خرچہ۔

نظمِ عجیب

شہر میں تھا جو کئی روز سے شورے نہ شرے

بہت ارمان تھے بندے کی طبیعت میں بھرے

اتفاقاً کسی پرچے میں چھپی یہ خبرے

کہ کوئی لیڈرِ سرگشتہ و آوارہ گرے

آج تشریف یہاں لائے ہیں باکرّوفرے

یہ خبر پڑھ کے ہوا دل پہ نہایت اثرے

فیصلہ بس یہی عاجز نے کیا بے خطرے

ایسے جلسے میں کہ ہے مجمعِ اہلِ نظرے

سخت گھامڑ ہے وہ انساں کہ شرکت نہ کرے

الغرض قومی رضاکار کا سا روپ بھرے

شوق سے ہم نے کیا جانبِ جلسہ سفرے

دیکھتے کیا ہیں کہ یارانِ کراچی کے پرے

مونہہ اٹھائے چلے آتے ہیں مثالِ شترے

لہ بشیر درّانی مرحوم نے مجھے اسی قسم کی ایک نظم سنائی تھی۔ جو غالباً محشر عنایتی مرحوم کی طبع زاد تھی۔ نظم بہت پسند آئی اور میں نے اسے پاکستانی قالب میں ڈھال دیا۔

اور جلسے کا یہ پنڈال سجا ہے کہ ارے
ہے نمائش کی سی سج دھج ادھر ادر ادھرے
یوں تو ہر رنگ کے جھنڈے ہیں بہشتِ نظرے
ہیں مگر لیگ کی نسبت سے علم سبز ہرے
بڑھ کے یہ دیکھا کہ اسٹیج پہ حلقہ سا کرے
جلوہ فرما ہیں عجب شان سے کچھ فتنہ گرے
مختصر یہ کہ وہ جلسہ تھا بہت با اثرے
کہ اچانک ہوا۔اعلان بصد شور و شرے
لیجئے آتے ہیں تقریر کو وہ راہ برے
جو الٹ دیتے ہیں الفاظ سے فوجوں کے پرے
ناگہاں ایک نئی وضع کے آشفتہ سرے
فارغ البال کچھ ایسے کہ نہ مادہ نہ نرے
تن پہ اچکن سرِ اقدس پہ سیہ کیپ دھرے
مسکراتے ہوئے کرسی سے اُٹھے بے خطرے
اٹھ کے مائک کی طرف باخبر و بے خبرے
یوں دبے پاؤں بڑھے جیسے کوئی داؤ کرے
پہلے اک نعرۂ مستانہ کیا ہیچو خرے
بلبلانے لگے پھر جوش میں مثلِ شترے

کہ اری قوم زبوں ہمت و خستہ جگرے
تجھ کو اللہ کبھی ہم سے نہ محروم کرے
دیکھ تو ہم نے ترے واسطے کیا کام کرے
گھر دئے اُن کو جو آئے تھے ہزاروں نگھرے
ہم پھرے ہیں تری خدمت کے لئے در بدرے
کبھی لندن کبھی پیرس کبھی اُس سے بھی پرے
دل میں اسکیم تو ہاتھوں پہ تجاویز دھرے
بس ترے کام میں مصروف ہیں شام و سحرے
باوجود اِس کے بھی تو دم جو ہمارا نہ بھرے
شاد و آباد تجھے خالقِ اکبر نہ کرے
سخت ریمارک یہ لیڈر نے جونہی پاس کرے
ہم بھی اِس مجمع کم ظرف میں بیٹھے تھے بھرے
ضبط مشکل تھا تو چیخے کہ اے بے خبرے
کون یوں قوم کی خدمت میں پھرا در بدرے
کس نے گھر دے کے بسائے ہیں مہاجر نگھرے

گو کہ قبضے میں ہمارے تھا نہ زوبے نہ زرے
ہم وہیں ہوگئے آباد جہاں آن مرے
بس یہ الفاظ جو بندے نے کہے بے خطرے
چیخا وہ لیڈرِ جلسہ کوئی حاضر ہے ارے!
انتظامات تو پہرے کے بہت تھے مگر ے
کیسے اِس جلسے میں گھس آئے پڑا وے کے خرے
ہم وہ ہیں جن کا غلامِ ازلی ہر بشر ے
ایسے گستاخ کا کیا دخل یہاں پھینکو پرے
سُن کے لیڈر کے یہ الفاظ درشت اور کھرے
دوڑے پہرے کے جواں ہاتھ میں لیکر تبرے
پھر تو وہ جوت پڑا ہم پہ کہ بے موت مرے
یا بہ دستِ دگرے دست بدست دگرے
للہ الحمد کہ اِس شان سے ہم پہونچے گھرے

عذر خواہی

شکایت ایک دن کی کانگرس کے کچھ رفیقوں نے!
ہوئے ہیں آپ کب سے گوشہ گیرِ خانۂ ماتم؟
یہ مانا آپ کا رجحان ہے اب لیگ کی جانب
خیالِ خاطرِ احباب بھی اِک چیز ہے تاہم
سیاست میں ہمارا ایک ہی مقصودِ خاطر تھا
سروں پر سایہ افگن ابتدا سے ایک ہی پرچم
سُنا میں نے جو شکوہ اپنے احبابِ سیاست کا
وہ جن کی دوستی پر ناز تھا پہلے مجھے ہر دم
بہ عنوانِ مناسب اِس طرح سے عذر خواہی کی!
کہ اب تک سلسلہ میری عقیدت کا ہے مستحکم
بجا ہے گر تغیّر آپ میں اور مجھ میں آجائے
زمانہ انقلاب انگیز ہے اب قبلۂ عالم
اگرچہ آپ سے اب بھی وہی دل کو تعلق ہے
مگر یہ فکر بھی رہتی ہے ذوق و شوق میں ہر دم
کہ آخر کانگرس کی بزم میں جاؤں تو کیا جاؤں
زبانِ یارِ من ہندی و من ہندی نمی دانم

مکتوبِ دلّی

مجھے اِک دوست نے دلّی سے لکھا ہے خط میں
آپ بچھڑے ہوئے احباب کو کیا بھول گئے
آپ کو شہرِ کراچی کی ہوا راس آئے
ہاں مگر خطّۂ دلی کی فضا بھول گئے
کیف و مستی میں کلفٹن کی ہوائیں کھا کر
لبِ جمنا کی سکوں بخش ہوا بھول گئے
نازنینانِ کراچی کو مبارک کہ جناب!
شہرِ دہلی کے حسینوں کی ادا بھول گئے
اپنی آزاد حکومت کے محل میں رہ کر
قلعۂ شاہ جہاں یاد ہے یا بھول گئے!
ہر نئی قبر سے اب تک یہ صدا آتی ہے
منظرِ قتلِ شہیدانِ وفا بھول گئے
رنج یہ ہے کہ عزیزوں کو نہیں یاد عزیز
شکوہ یہ ہے رفقاء کو رفقاء بھول گئے

جواب مکتوب

شکریہ پُرسشِ اربابِ وفا کا اے دوست!
تیرے خط سے روشِ مہر و وفا یاد آئی!
خود فراموش سہی میں مگر اے جانِ رئیس
تیرے مکتوب سے کیا جانیئے کیا یاد آئی؟
ہائے کس وقت یہ مکتوبِ محبت پہونچا
ہائے کس وقت مسیحا کو دوا یاد آئی
ذکرِ ماضی عجب انداز سے چھیڑا تو نے
وہی دلّی وہی دلّی کی فضا یاد آئی!
صدر بازار کراچی سے ہوا جب بھی گذر
چاندنی چوک کی رنگین فضا یاد آئی!
جب بھی اردوئے معلّٰی کی بھنک سن پائی
اردو بازار کی فوراً بخدا یاد آئی
بارہا یادِ عزیزاں میں بہائے آنسو
بارہا صحبتِ خاصِ رفقاء یاد آئی!
مختصر یہ ہے کہ دلّی سے بچھڑ کر اے دوست
وہی دلّی وہی دلّی کی فضا یاد آئی

کہ تمہیں

حق کا اظہار ہے ہر شاعرِ خوددار کا فرض
سچ کہو جرأتِ اظہار ہمیں ہے کہ تمہیں
لہجۂ صدق ہے رعنائیٔ گفتار کا حسن
پاسِ رعنائیٔ گفتار ہمیں ہے کہ تمہیں
سامراجی روش و فکر کے پیغام برو!
ہوسِ فتنہ و پیکار ہمیں ہے کہ تمہیں
بھوک افلاس فسادات تعصب نفرت
مرحلۂ زیست کا دشوار ہمیں ہے کہ تمہیں

فن کہ فرہنگِ صداقت ہے کسے کہتے ہیں
اور کیا چیز ہے فن کار تمہیں کیا معلوم؟
شفقِ خونِ شہیداں سے ہے آرائشِ زیست
طرزِ رنگینیٔ افکار تمہیں کیا معلوم؟
تم یہ کہتے ہو کہ مجبور کی تقدیر ہیں ہم
کیا ہیں جمہور کی اقدار تمہیں کیا معلوم؟

صبحِ بہار

منظرِ شامِ گلستاں عالمِ صُبحِ بہار
جلوہ ریز و جلوہ پاش و جلوہ پوش و جلوہ بار
اللہ اللہ یہ نظارہ اے جمالِ منتظر
اللہ اللہ یہ تجلّی اے نگاہِ انتظار
اے تماشو! یہ تماشا اے نظرو! یہ نظر
اے کرشمو! یہ کرشمہ اے شگوفو! یہ بہار
حُسن کی آمیزشیں دیکھ اے جہانِ رنگ و بو
رنگ و بو کی سازشیں دیکھ اے عروسِ لالہ زار!
ہائے وہ سرسبز شاخیں۔ شاخ آہوئے خُتن
ہائے وہ صد رنگ کلیاں نافۂ مشک تتار
زائرینِ شہرِ گل وہ کارواں در کارواں!
کاروانِ گل بداماں وہ قطار اندر قطار
اے سحر! اے جلوۂ حُسنِ عذارِ گُل رُخاں
اے شفق! اے منظرِ گل گونۂ رخسارِ یار
موجۂ بادِ صبا۔ نیرنگ و نیرنگ آفریں
عطرِ انفاسِ شمیم افسوں گر و افسانہ کار

خاک بھی سرمایۂ دامن بہ فیضِ رنگ و بو
خار بھی نو بادۂ گلشن بہ حُسنِ اعتبار
کشتِ زارِ دید میں دیدار کی نشو و نما
آئینوں کی کھیتیوں میں فصلِ جلوہ کی بہار
اے جمالِ شاہدِ صبح! اپنے جلووں پر جِلا،
اے نوائے طائرِ وقت! اپنے ماضی کو پُکار
آج اے سلمائے سنبل اپنی زلفوں کو جھٹک
آج اے عذرائے غنچہ اپنے عارض کو نکھار
آج اے جانِ بہاراں۔ خلعتِ رنگیں پہن
آج اے روحِ گلستاں جامۂ کہنہ اُتار
جھوم اے گوہر فشاں بادل۔ بہ طرفِ گلستاں
ناچ اے رقص آفریں بھونرے بروئے شاخسار
کُوک اے کوئل کہ سناٹا طبیعت پر ہے۔ بوجھ
بُول اے بلبل کہ خاموشی طبیعت پر ہے بار
حبس میں عہدِ طرب گذرا چل اے بادِ سحر
خشک سالی میں برس گذرے برس۔ ابرِ بہار
نیند میں صدیاں کٹیں بیدار اے عمرِ رواں
جادۂ ویراں میں جُگ بیتے اٹھ اے منزل سوار

ہم لوگ

شامِ بیداریٔ ملّت کی سحر ہیں ہم لوگ
غدر کے نخلِ بغاوت کا ثمر ہیں ہم لوگ

آؤ۔ اِک منزلِ تازہ کی طرف جست کریں!
آخرِ منزلِ اربابِ سفر ہیں ہم لوگ

جائے اور جا کے کوئی اہلِ نظر سے کہہ دے
نقطۂ جاذبۂ فکر و نظر ہیں ہم لوگ

اب اِسی خاک سے تعمیرِ جہاں کرنی ہے
کون کہتا ہے فقط خاک بسر ہیں ہم لوگ

جن شہیدوں کی دعائیں تھیں شہادت کی نوید
اُن شہیدوں کی دعاؤں کا ثمر ہیں ہم لوگ

جس کو تو سُن نہ سکا وقت کے ہنگاموں میں
سُن کہ وہ غلغلۂ فتح و ظفر ہیں ہم لوگ

جس کو تاریخ نے کُہنہ کبھی ہونے نہ دیا
اُن شہیدوں کی دعاؤں کا اثر ہیں ہم لوگ

۲/۴

نامکمل ہیں جو اس شہر میں گھر ۲/۴
غُربا کیوں نہ ہوں پھر خاک بسر ۲/۴
چار میں ایک تو پبلک ہے بہت آسودہ
لطفِ ہستی سے ہیں بیگانہ مگر ۲/۴
کس کو اس شہرِ پُر آفات میں راحت ہو نصیب
جس میں آباد ہوں ہنگامہ و شر ۲/۴
لیڈروں میں ہے فقط ۱/۴ خلوص؛
اور دل میں طلبِ عہدہ و زر ۲/۴
فربہیٔ بدنِ قوم پہ مغرور نہ ہو
گوشت اِس مرغ میں چوتھائی ہے پَر ۲/۴
آ تجھے نسخۂ مستی میں بتاؤں اے دوست
۲/۳ تو وہسکی ہو بیئر ۲/۴
روزِ میلاد پہ قائد کی کہوں مطلعِ نو
جس کے ہر حرف میں ہو جذب و اثر ۲/۴

لہ اس ردیف و قافیہ کی ایک نظم کا ذکر میں نے سنا تھا۔ پنجاب کے کسی استادِ شاعر نے اس بحر اور زمین میں طبع آزمائی کی تھی۔ بعض جاب نے مجھے اُن کے دو چار شعر سنائے بھی تھے۔ لطف آیا اور اسی انداز کی ایک نظم خود بخود تیار ہو گئی۔

جیسے دو نقطوں میں ہو ایک صفرؒ ۲/۴
ہے یونہی لیگ میں قائد کا اثر ۲/۴
اپنے قائد کو کسی سے بھی نہ خائف پایا
گو کہ لیڈر ہیں ہوا کرتا ہے ڈر ۲/۴
آج اُس مردِ مجاہد کی ہے تقریبِ وصال
رنجِ فرقت میں ہوئی جس کی بسر ۲/۴
کیا کہوں قوم کی رو دادِ تباہی جس میں
ہار گر ۳/۴ ظفر ۲/۴
برِّ کوچک میں ہوئی آپ کی تقسیم عجیب
اُدھر اور اِدھر ۲/۴
شیخ و مسٹر سے کوئی کام نہ ہوگا نہ ہوا
غبی تنگ نظر ۲/۳
دیکھ مایوس نہ ہو قوم کی حالت سے کبھی
کہ ہر اک شب میں ہے امکانِ سحر ۲/۴
ٹرٹراہٹ پہ تعجب ہے مجھے مسٹر کی
کیوں نہ ٹرائے کہ مسٹر میں ہے ٹر ۲/۴
بخدا اس کی طوالت سے نہیں تو آگاہ
شیخ کی ریش کہ آتی ہے نظر ۲/۴

ؒ صفر اردو میں نظر کا ہم قافیہ ہے۔ بہ سکون ف نہیں استعمال ہوتا۔

عذاب

یہ کس کی تیغ سے زخمی ہے آج اپنا گلُو!
یہ بہ رہا ہے زمینِ وطن پہ کس کا لہو
نسیمِ صبحِ چمن کی ستم ظریفی سے
یہ کیسے پھول کھِلے ہیں کہ اِن میں رنگ نہ بُو
عجب کہ اپنے ہی صحرائے ناز و نعمت میں
شکارِ تیرِ ہلاکت قبیلۂ آہو!
غضب کہ اپنی ہی بزمِ جمال و زینت میں
بپا ہو معرکۂ جنگِ شانۂ و گیسو
خدا کی شان مسلمان کو قتل کرکے نماز
خدا کی شان کہ غازی کا خوں بہا کے وضو!
نہیں کچھ اس کے علاوہ تصادمِ مابینؔ[1]
نزاعِ شیشۂ و آہن فسادِ سنگ و سبو
دیارِ پاک میں اہلِ دیارِ پاک کا خون
چمن کے صحن میں یارانِ رنگ و بو کا لہو
کوئی گناہ تھا اے دل! حصولِ آزادی؟
یہ کس عذاب میں ہم ہیں یہ کس عذاب میں تو

---

[1] کراچی کے فرقہ وارانہ فسادات کی طرف اشارہ ہے۔

نرخنامہ

مطبوعات رئیس اکیڈمی

(رئیس امروہوی)

(از یکم ستمبر ۱۹۸۴ء)

نام کتاب		نرخ
نفسیات وما بعد النفسیات	حصہ اوّل	8/=
نفسیات وما بعد النفسیات	حصہ دوم	8/=
نفسیات وما بعد النفسیات	حصہ سوم	8/-
عجائب نفس	حصہ اوّل	8/=
عجائب نفس	حصہ دوم	8/=
مظاہر نفس	حصہ اوّل	8/=
مظاہر نفس	حصہ دوم	8/=
بے سانس بھی آہستہ	حصہ اوّل	8/=
بے سانس بھی آہستہ	حصہ دوم	8/=
جنسیات	حصہ اوّل	8/=
جنسیات	حصہ دوم	8/=
جنسیات	حصہ سوم	8/=
جنسیات	حصہ چہارم	8/=
جنسیات	حصہ پنجم	8/=
توجہات	حصہ اوّل	8/=
توجہات	حصہ دوم	8/=
مراقبہ	حصہ اوّل	8/=
مراقبہ	حصہ دوم	8/=
جنات	حصہ اوّل	8/=
جنات	حصہ دوم	8/=

نام کتاب		نرخ
ہپناٹزم	حصہ اوّل	8/=
ہپناٹزم	حصہ دوم	8/=
عالم برزخ	حصہ اوّل	8/=
عالم برزخ	حصہ دوم	8/=
حاضرات ارواح	حصہ اوّل	8/=
حاضرات ارواح	حصہ دوم	8/=
عالم ارواح	حصہ اوّل	8/=
عالم ارواح	حصہ دوم	8/=
اچھے مرزا (طنزیہ مضامین)		10/=
آنا من الحسین (قصیدے اور مرثیے)		10/=
نجم السحر (رومانی منظومات)		15/=
آثار (قومی منظومات)		15/=
قطعات رئیس امروہوی	جلد اوّل	75/=
قطعات رئیس امروہوی	جلد دوم	85/=
قطعات رئیس امروہوی	جلد سوم	95/=
قطعات رئیس امروہوی	جلد چہارم	95/=
ضمیر خامہ (مجموعہ مثنویات وقصائد)		85/-
کلیات رئیس امروہوی		95/-
کتب فروشوں کے لئے معقول کمیشن		

اس نرخ نامے کی رو سے تمام سابقہ نرخ نامے منسوخ تصور فرمائیں۔

رئیس اکیڈمی ۱۲۹-اے، مانک جی اسٹریٹ۔ گارڈن ایسٹ۔ کراچی۔

کوڈ نمبر 74400

فون ۷۱۰۵۵۶ / ۷۱۰۶۳۳

نرخنامہ

مطبوعاتِ رئیس اکیڈمی

(رئیس امروہوی)

از یکم ستمبر ۱۹۸۴ء

نام کتاب	نرخ	نام کتاب	نرخ
نفسیات و مابعد النفسیات ۔ حصہ اوّل	8/-	ہپناٹزم .... حصہ اوّل	8/-
نفسیات و مابعد النفسیات ۔ حصہ دوم	8/-	ہپناٹزم .... حصہ دوم	8/-
نفسیات و مابعد النفسیات ۔ حصہ سوم	8/-	عالمِ برزخ .... حصہ اوّل	8/-
عجائبِ نفس .... حصہ اوّل	8/-	عالمِ برزخ .... حصہ دوم	8/-
عجائبِ نفس .... حصہ دوم	8/-	حاضراتِ ارواح .... حصہ اوّل	8/-
مظاہرِ نفس .... حصہ اول	8/-	حاضراتِ ارواح .... حصہ دوم	8/-
مظاہرِ نفس .... حصہ دوم	8/-	عالمِ ارواح .... حصہ اوّل	8/-
لے سانس بھی آہستہ .... حصہ اوّل	8/-	عالمِ ارواح .... حصہ دوم	8/-
لے سانس بھی آہستہ .... حصہ دوم	8/-	اچھے مرزا (طنزیہ مضامین)	10/-
جنسیات .... حصہ اوّل	8/-	انا من الحسین (قصیدے اور مرثیے) ...	10/-
جنسیات .... حصہ دوم	8/-	نجم السحر (رومانی منظومات)	15/-
جنسیات .... حصہ سوم	8/-	آثار (قومی منظومات)	15/-
جنسیات .... حصہ چہارم	8/-	قطعات رئیس امروہوی .. جلد اول	75/-
جنسیات .... حصہ پنجم	8/-	قطعات رئیس امروہوی .. جلد دوم	85/-
توجہات .... حصہ اوّل	8/-	قطعات رئیس امروہوی .. جلد سوم	95/-
توجہات .... حصہ دوم	8/-	قطعات رئیس امروہوی .. جلد چہارم	95/-
مراقبہ .... حصہ اول	8/-	ضمیرِ خامہ (مجموعہ مثنویات و قصائد) ...	85/-
مراقبہ .... حصہ دوم	8/-	کلیاتِ رئیس امروہوی	95/-
جنات .... حصہ اول	8/-	کتب فروشوں کے لئے معقول کمیشن	
جنات .... حصہ دوم	8/-		

اس نرخ نامے کی رو سے تمام سابقہ نرخ منسوخ تصور فرمائیں۔

رئیس اکیڈمی ۱۲۹۔ اے مانک جی اسٹریٹ۔ گارڈن ایسٹ۔ کراچی۔ کوڈ نمبر 74400
فون 710556 - 710733